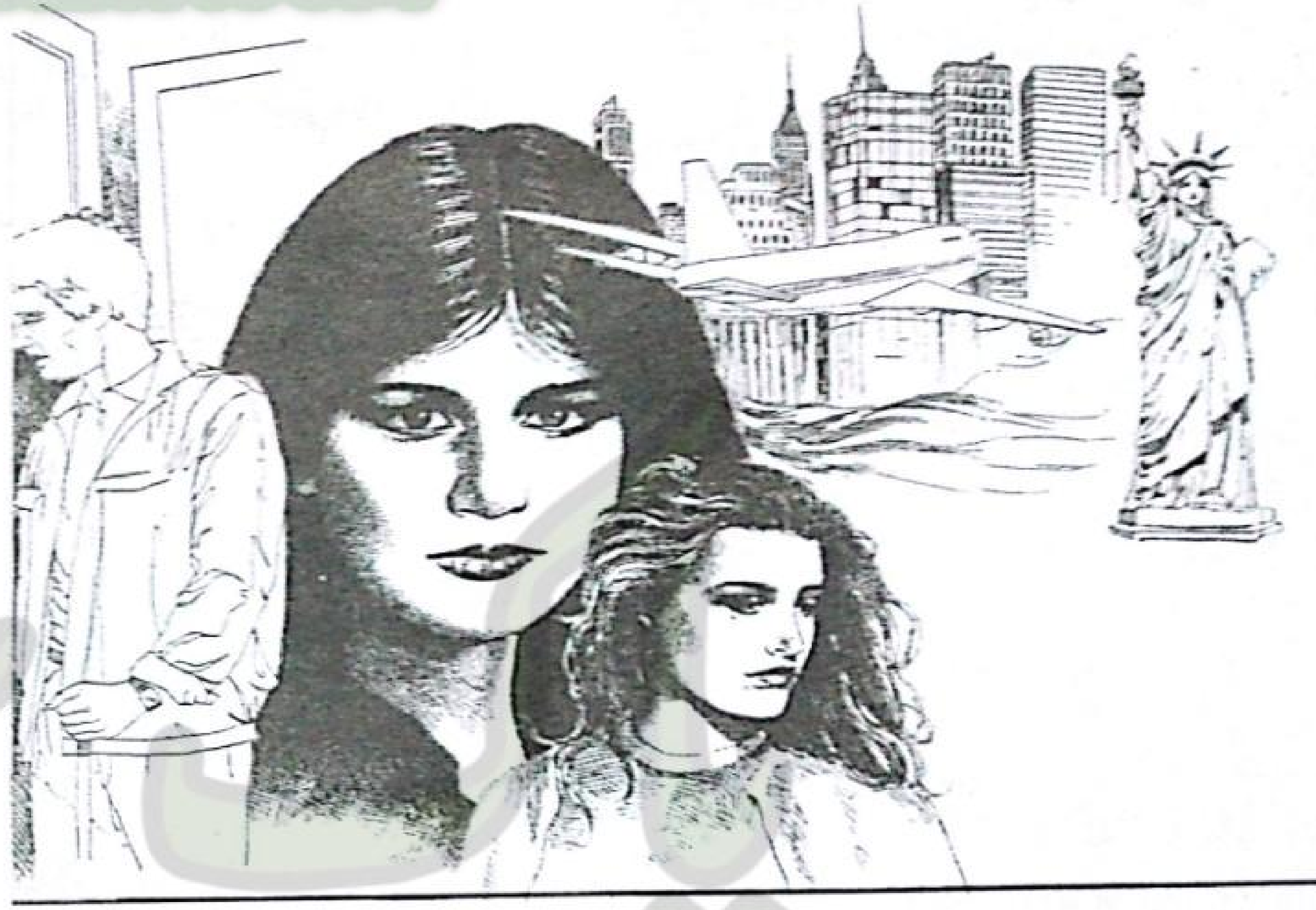


ناولٹ

کہر میں ج

نایاب جیلانی





ناولٹ

کہر میں آنچ

نایاب جیلانی

سپر لگژری ''کیمری'' فل اسپیڈ کے ساتھ نیویارک کی کارپنڈ ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔ سورج کی کرنیں چھتوں پر پڑ رہی تھیں جہاں برف پڑی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا سنہری کرنوں کی چمک سے کئی ہیرے دمک رہے ہوں۔

مگر یہ چمک اس کی آنکھوں میں ریت بھر رہی تھی۔

اگر خالہ اسے اتنا مجبور نہ کرتیں، اس کے سامنے گریہ نہ کرتیں اور مرنے سے پہلے عہد نہ لیتیں تو شاید

فاطمہ کبھی ان اجنبی راہوں کی طرف نہ پلٹتی...... ان کٹھور لوگوں کی بستی میں نہ آتی۔ خالہ کی ہر بات پر سر جھکانا اس کا فریضہ تھا۔ خالہ کی محبت اور فرمانبرداری اس کے لیے عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔

خالہ کی یاد میں آج بھی فاطمہ کی آنکھیں نمی سی بھر جاتی تھیں۔ اس کا ویزا لگا اور ٹکٹ کنفرم ہوا اِدھر خالہ اپنے آخری ''فرض'' سے فراغت پا کر خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ فاطمہ کے ویزے کا انتظار کررہی تھیں۔ اس کی زندگی میں در آنے والی طغیانی کے بعد سکون اور شانتی کا انتظار کررہی تھیں۔ جیسے ہی ماموں نے ایک مرتبہ پھر اس کا ویزا وغیرہ بھیجا...... ٹکٹ کے پیسے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیے...... اُدھر خالہ نے مکان بیچ کر سارے اماؤنٹ کے ڈالرز بنوائے اور فاطمہ کو اپنے آنسوؤں سے زیر کر کے جہاز میں بٹھا دیا...... ابھی وہ سفر میں تھی جب اطلاع ملی گئی کہ خالہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ شاید وہ فاطمہ کو اپنی زندگی میں محفوظ ٹھکانے پر بھیجنے کا اطمینان کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئی تھیں...... یا پھر اپنی بیٹی کا لدا بوجھ اتار کر اللہ کے حضور حاضر ہوئی تھیں۔

انہیں گمان ہوگا...... یہ عمل ان کی بیٹی کے رستوں میں بکھرے کانٹے سمیٹ دے گا۔ شاید خالہ کا گمان غلط نہ ہو...... مگر ہر کوئی اپنے عمل کا کیا پاتا ضرور ہے۔ چاہے کسی بھی صورت میں ہو...... دل دکھانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے اگر کوئی ان کا دل دکھا جائے تو کیا ہو؟ زندگی چھین لینے کی کوشش کرنے والے یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ کوئی ان کی زندگی کے ساتھ اس طرح کرے تو کیا ہو...؟ بے بس کردینے والے جب خود بے بس ہوجاتے ہیں تو اپنی بے بسی کا حال تک سنا نہیں سکتے۔

نیویارک ہائی وے پر بکھری ایسی دردناک یادیں آج بھی فاطمہ کی روح کو جھنجوڑتی تھیں۔ جیسے ایک فلم سی تھی جو آنکھوں کے پار چل رہی تھی۔ منظر کے بعد منظر بدل رہا تھا۔ چہرے کے بعد چہرہ بدل رہا تھا۔ آنکھوں کے رنگ بدل رہے تھے۔ لوگ بدل رہے تھے، عکس بدل رہے تھے۔ حتیٰ کہ شہر بدل رہے تھے۔

اچانک چلتی ''کیمری'' کی خاموش فضا میں مردانہ آواز ابھری تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والا بظاہر سنجیدہ نظر آتا بندہ ایک دم بولنا شروع ہوا تو فاطمہ کو خیال آیا۔ وہ گاڑی میں اکیلی نہیں تھی اور سوچوں کے سفر میں بہت دور تک نکلی ہوئی تھی۔ اس کی یادیں نیویارک کی طرح بہت گنجان تھیں۔ پھر بھی وہ لمحہ بھر میں یادوں کے طویل سلسلے کو جھٹک کر سیدھی ہوگئی۔ اس کا دھیان اردگرد نہیں، امر کی گفتگو اور باتوں کی طرف تھا۔ وہ شاید خود کلامی کررہا تھا۔ یقیناً یہ امر ہی تھا...... ماہر کا دوست بلکہ جگری دوست، بیچ میں چودہ سال آچکے تھے پھر بھی فاطمہ نے ائرپورٹ پر امر کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میں پہچان لیا تھا۔ تب کے اور اب کے امر میں کافی فرق تھا۔ تب وہ ایک لاابالی، بے فکرا، ہنس مکھ، شوخ مزاج اسٹوڈنٹ تھا۔ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ لیکن اس وقت وہ پہلے والے امر سے کافی مختلف لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ بیچ میں چودہ سال آگئے تھے۔ گو کہ وہ اب بھی ہینڈسم اور پرفیکٹ تھا مگر اس کی پرسنالٹی سے سنجیدگی میچ نہیں کررہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر اس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ وہ مغرب کا پروردہ ضرور تھا لیکن آج بھی مغرب کے لیے اس کے جذبات منفی ہی تھے۔ فاطمہ کو وہ پہلے والا ہی امر لگا...... جب وہ ماموں کے گھر کی مین روڈ پر اونچی آواز میں گوروں کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا۔

فاطمہ کو اس وقت بھی وہ پہلے والا امر ہی لگا...... ویسا ہی جوشیلا اور بھڑکیلا...... اور اس کا دوست بھلا کیسا ہوگا؟ پہلے کی طرح ہی سرد، برفیلا، اجنبی......

اس کا خیال بھٹک کر ماہر کی طرف لپکنے لگا تھا۔ اس نے خود کو ملامت کر کے ذہن امر کی باتوں اور غصے کی طرف لگایا تھا پھر ایک گہری افسردہ سانس اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

''بڑی طاقتیں ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے ویٹو پاور کا استعمال کرتی ہیں۔ وہ پاور بڑی ریاست کی سربراہی سے حاصل ہو...... دولت سے حاصل ہو یا حسن سے...... اپنے مفاد کے لیے بڑی طاقتیں کچھ نہیں دیکھتیں۔ چھوٹے ملکوں اور چھوٹے لوگوں کو کچل کر رکھ دیتی ہیں۔'' فاطمہ کے جواب نے لمحے بھر کے لیے امر کو سن کر کے رکھ دیا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کا ہاتھ ہولے سے کپکپا گیا۔ جیسے وہ سمجھ گیا تھا۔ فاطمہ کا اشارہ کس طرف تھا اور وہ کن بڑی طاقتوں کا ذکر کررہی تھی۔

''وقت بڑی طاقتوں کو سرنگوں کردیتا ہے۔'' کافی دیر بعد امر نے جیسے تبصرہ کیا تھا۔ فاطمہ کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

''وقت نہیں...... بڑی طاقتوں کی شاطرانہ چالیں جو کبھی کبھار الٹ بھی جاتی ہیں...... اور کبھی کبھار مات کرنے والوں کو شہ مات کا مزہ بھی چکھنا پڑتا ہے...... اور یہ تقدیر کی شہ مات ہوتی ہے۔'' اس کا لہجہ کسی قدر نم اور افسردہ تھا۔ امر لمحے بھر کے لیے چپ سا ہوگیا۔

''تم بہت سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہو۔'' اس کا انداز ذرا بے تکلف قسم کا تھا۔ تاہم وہ اس کی سنجیدگی پر چونک ضرور گیا تھا۔

''بیچ میں چودہ سال آچکے ہیں امر بھائی......'' وہ جتانا نہیں چاہتی تھی پھر جانے کیسے زبان سے پھسل گیا۔ امر بھی چپ سا کر گیا۔ اب بھلا کیا بولتا۔ جیسے سارے لفظ بے جان اور بودے ہوچکے ہوں۔

کافی دیر تک کار میں معنی خیز سی خاموشی چھائی رہی۔ جسے امر نے خود ہی سمیٹ ڈالا۔

''سفر تو اچھا گزر گیا......؟'' اسے کچھ تو کہنا ہی تھا یا شاید وہ فاطمہ کے لفظوں کی گھٹن کو زائل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اچانک ہی گفتگو کو اک الگ موڑ دے دیا تھا۔ شاید اسے بات بدلنے کے لیے بہترین موضوع مل گیا تھا۔

''پتا نہیں ...... ترکی میں جہاز کا اسٹے (وقتی قیام) تھا۔ وہیں پہ خالہ کی وفات کا پتا چلا...... پاکستان سے کال آئی تھی۔'' فاطمہ کی آواز پھر سے بھرّا گئی۔ امر کی آنکھوں میں بھی تاسف ابھرنے لگا...... پھر اس نے قدرے جھجک کر پوچھا تھا۔

''وہ حورعین کی والدہ تھیں نا؟''

''ہاں......'' فاطمہ کے حلق تک میں ریت بھر گئی تھی۔ دریائے ہڈسن کے کناروں پر بکھری سوکھی ریت اڑتی ہوئی اسے غبار آلود کر گئی تھی۔ فاطمہ کا منہ، ناک اور آنکھیں ریت کے نوکیلے ذروں سے بھر گئے تھے۔ اسے لگا حورعین کے نام کے ساتھ ذلتوں کے کئی باب اور کئی اوراق کھلتے چلے گئے تھے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے چکراتا سر تھام لیا تھا۔ امر نے اس کی بگڑتی طبیعت دیکھی اور پریشان ہوگیا۔ پھر اس نے جلدی سے پانی کی بوتل کھول کر اسے پکڑائی۔ وہ خاصا گھبرا گیا تھا۔ گو کہ وہ ایک ڈاکٹر تھا پھر بھی......

''تم ٹھیک ہو فاطمہ......؟'' اس نے کافی دیر بعد جب وہ کچھ سنبھل گئی تب پوچھا تھا۔

''بہتر ہوں۔'' اسے بہ مشکل ہی بولنا پڑا تھا۔ پانی کی بوندیں حلق میں اتریں تو سوکھا گلا کچھ تر ہوا تھا۔ پھر وہ ذرا سنبھل گئی تھی۔ آخر امر پر کچھ کیوں ظاہر ہونے دیتی؟ گو کہ امر اس کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف تھا...... ہر اس ذلت سے جو اس نے نیویارک سے سمیٹی تھی...... ہر وہ ٹھوکر اور دھوکا جو اس نے اپنوں سے کھایا تھا۔ امر سب کچھ تو جانتا تھا...... ہر بات، ہر واقعہ، فاطمہ کی زندگی کے ایک، ایک پل سے واقف تھا۔

پھر اس نے امر کا دھیان خود سے ہٹانے کی غرض سے پوچھا۔

''ماموں اور مامی کیسے ہیں؟'' اس کی نارمل آواز گاڑی میں گونجی تو امر نے سکون کی سانس لی۔ ورنہ وہ خاصا پریشان ہوگیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ پہلے اسے کسی میڈیکل اسٹیشن پر لے جائے مگر فاطمہ اب کافی بہتر دکھائی دے رہی تھی۔

''انکل اور آنٹی ٹھیک ہیں...... تمہارا انتظار کررہے ہیں۔'' امر نے نرمی سے بتایا اور پھر بیک ویو مرر

سے فاطمہ کے تاثرات دیکھنے چاہے...... وہ اس کے چہرے سے کچھ کھوجنا چاہتا تھا۔ اس نے کسی اور کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟ چلو ماہر کانہ پوچھتی پھر بھی کم ازکم اسے بچوں کے بارے میں تو ضرور استفسار کرنا چاہیے تھا۔ وہ بچے جو اس کے آنے کی خبر پہ سخت دیوانے ہورہے تھے۔ خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ اتنے پُرجوش تھے اور بہت دن سے اسے ویلکم بولنے کی تیاریاں کررہے تھے۔

''بچے تمہارا بہت شدت سے انتظار کررہے ہیں۔'' امر نے خود ہی ڈھیٹوں کی طرح بتادیا تھا کیونکہ اسے محسوس ہورہا تھا فاطمہ بالکل بھی بچوں کے بارے میں کچھ پوچھنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اسے فاطمہ کے سپاٹ تاثرات پہ عجیب سادکھ ہوا تھا...... کیونکہ بچوں کا خیال، ان کی خوشی، دیوانگی اور فاطمہ کی آمد کے لیے پُرجوش ہونا وہ خود ملاحظہ کرچکا تھا۔

''اگر فاطمہ کے ایسے ہی کٹھور تاثرات رہے تو بچوں کا دل کس قدر ٹوٹ جائے گا۔'' امر کو آنے والے وقت سے خوف سا آیا۔

گوکہ فاطمہ پہلے سے بہت بدل چکی تھی۔ اس کا وہ بچپنا، لاابالیت اور بے وقوفانہ سا تاثر اب کہیں نہیں تھا۔

وہ بہت سنجیدہ ہوچکی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار اور ٹھہراؤ آچکا تھا۔

اور سب سے بڑی بات فاطمہ کو اپنے تاثرات بھی چھپانے آگئے تھے۔ گویا وقت واقعی بہت آگے تک جاچکا تھا۔ اتنا آگے کہ امر کو بھی فاطمہ سے بات کرنے کے لیے بہت دیر تک سوچنا پڑ رہا تھا۔ وہ کیسے اور کس طرح سے بچوں کا ذکر چھیڑے؟ وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا جب فاطمہ نے خود ہی خاموشی کو سمیٹ ڈالا۔ شاید وہ اس معنی خیز چپ پر خود ہی اکتا گئی تھی۔

''کیا ماموں نے گھر بدل لیا......؟'' فاطمہ نے شیشے سے پار دریائے ہڈسن کے پل کو دیکھا تھا۔ یہ رستہ ماموں کے گھر کو نہیں جاتا تھا تو پھر یہ لوگ کہاں جارہے تھے؟ اس نے بہت نیچے تک جھانک کر دیکھا تھا۔ بہت دور تک ہڈسن کا پانی بکھر رہا تھا۔ بہت خوب صورت اپارٹمنٹ نما یاٹ لہروں پر تیرتی سفید بطخوں کے مانند لگ رہی تھیں۔ ہڈسن کے نیلے پانی پر تیرتے بگلے اتنے سفید تھے کہ موتیوں سا گمان ہوتا۔ بہت دور سے سفید نگینے معلوم ہوتے تھے۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''دریا کے اس پار......'' امر نے اپنے تئیں خاصا ہلکا پھلکا جواب دیا تھا جو فاطمہ کو قطعاً ناکافی لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر تفکر کے گہرے احساس کو دبا کر پوچھا۔

''یہاں کیوں آئے ہیں؟'' وہ بے چین ہوگئی تھی...... یہ امر تو وہی تھا۔ چودہ سال پہلے والا...... بے ڈھنگا، بیجو کہیں، جاتا کہیں تھا...... لینے کسی کو آتا اور لے کسی اور کو جاتا تھا۔

''ہم کہاں آگئے ہیں؟'' ایک جگہ گاڑی رکتے دیکھ کر اس نے پھر پوچھا......

''ہمیں یہاں لنچ کرنا ہے پھر گھر کی طرف نکلنا ہے۔'' امر نے بالآخر لمبا چوڑا پروگرام بتادیا تھا۔ فاطمہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''تو کیا اب بھی مامی، فاطمہ کے لیے ایک وقت کھانا بنانے کا تردد نہیں کرسکتی تھیں؟'' وہ عجیب انداز میں سوچتی رہ گئی تھی...... گوکہ اسے مامی سے کسی بھی قسم کی ہمدردی یا نرماہٹ کی امید نہیں تھی۔ پھر بھی دل کو دھکا سا لگا۔ واقعی کچھ لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ مامی بھی ویسی ہی تھیں مغرور، نخریلی اور فاطمہ کو کم تر سمجھنے والی۔ اسے کوئی ایسی خوش فہمی تو نہیں تھی اور نہ ہی یہ امید تھی کہ مامی اس کا پُرجوش قسم کا استقبال کریں گی پھر بھی دل عجیب انداز میں بھرّا گیا تھا۔ اسے ان سنسان، تلخ اور اجڑے دنوں کا خیال آیا تھا جو اس نے مامی کی ہمراہی میں گزارے تھے اور جو اس نے ماموں کے عقوبت خانے میں بتائے تھے۔ وہ دن شاید فاطمہ عمر بھر نہیں بھلا سکتی تھی۔ وہ مہینے، وہ سال کیسے پُراذیت تھے۔ وہ وقت کتنا دردناک تھا...... گزرتا ہی نہیں تھا...... رینگ، رینگ کے چلتا تھا۔

اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔ پلکیں پپوٹوں سے جڑیں تو دو آنسو خود بخود ٹوٹ کر گالوں پر پھسل گئے تھے۔ وہ گزرے ہوئے ماضی کو یاد نہ کرنے کا عہد کرکے آئی تھی۔ مگر یادیں تو...... ایسے ہی بدعہد ہوتی ہیں تب اچانک امر نے اسے مخاطب کرلیا تھا۔

''تم نے میرے بارے میں پوچھا نہیں...... میں کیا کرتا ہوں؟ شادی کی یا نہیں؟ یعنی تمہاری نگاہ میں میری کوئی اہمیت ہی نہیں۔'' امر کا انداز قدرے خفگی لیے ہوئے تھا۔ فاطمہ کو چونک کر سنبھلنا پڑا تھا۔ پھر وہ ذرا سی سیدھی ہوئی۔

''میں یہی سوچ رہی تھی۔'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔ امر نے بیک ویو مرر سے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

''جھوٹ تمہیں بولنا نہیں آتا۔'' امر کا انداز جتانے والا تھا۔ فاطمہ چپ سی رہ گئی تھی۔

''تو اب بتادیں...... کیا کرتے ہیں آپ......؟'' فاطمہ نے ملائمت سے پوچھا۔ وہ واقعی امر سے یہی سوال کرنا چاہتی تھی...... لیکن ماضی کی تلخ یادوں میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔

''کچھ زیادہ نہیں...... بچے پالتا ہوں...... تمہارے بچے۔'' امر کا انداز صاف جتانے والا تھا۔ فاطمہ کو لمحہ لگا اور وہ زلزلوں کی زد میں آگئی تھی۔ اس کے دماغ کو چکر پھیریاں لگ گئی تھیں۔ ہر چیز جیسے گول، گول گھومتی جارہی تھی۔ اس کے دل کو بھی پنکھ لگ گئے تھے۔ جیسے صفحۂ ہستی پر بھونچال آگیا تھا۔ فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہر طرف ایک ہی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''تمہارے بچے......''

''تمہارے بچے......''

فاطمہ کو لگا وہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہوسکے گی۔ اس کی ٹانگوں پر لرزہ طاری تھا۔ اس کے پورے وجود پر لرزہ طاری تھا۔ وہ رعشہ زدہ مریض کی طرح کپکپانے لگی تھی اور وہ کپکپاتی جارہی تھی، تھرتھراتی جارہی تھی۔ اس پر قیامت آرہی تھی۔

''ڈیڑھ سال ہوچکا ہے حورعین کو گئے ہوئے۔ بچے اس سے بہت اٹیچ تھے۔ وہ ٹوٹ سے گئے۔ ان کو سنبھلنے میں اور کچھ نئی حقیقتوں کو قبول کرنے میں بہت وقت لگا تھا۔ پھر جب وہ سنبھل گئے تو تمہیں......'' امر مزید بھی بتارہا تھا۔ شاید اس کا مائنڈ میک اپ کررہا تھا۔ نئی حقیقتوں سے مراد شاید بچوں کو فاطمہ کے متعلق بتانا تھا۔ اور جب بچوں کو پتا چل گیا تو پھر کیا ہوا ہوگا؟ ان کا ردِعمل کیا تھا؟ اپنے باپ کی طرح ہی ظالمانہ، خودغرضانہ اور کٹھور......

فاطمہ کا رواں، رواں کان بن گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں متزلزل تھیں۔ جیسے کہیں تہلکہ مچا ہو...... جیسے کہیں قیامت بپا ہو۔ وہ دل جو چودہ سال سے تھپک، تھپک کر صبر کی لوریوں سے بہل رہا تھا اچانک ہی جنونی ہوگیا۔ بے قابو سا ہوگیا...... بے چین و بے قرار سا ہوگیا۔

وہ انہیں دیکھنے کے لیے مچل گئی، بلک اٹھی...... مضطرب ہوگئی۔ وہ جو لہو کی طرح جسم کے ریشے، ریشے میں رگ، رگ میں دوڑ رہے تھے۔ وہ کہاں تھے؟ وہ کس شہر میں تھے؟ کس نگر میں تھے؟ وہ انہیں کہاں، کہاں تلاشتی؟ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔

فاطمہ کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں روتی رہے۔ گریہ کرے...... بین کرے...... ماتم کرے۔ اسے لگا وہ زمانوں سے نہیں آج ہی جدا ہوئے ہیں بلکہ ابھی جدا ہوئے ہیں۔

امر نے مرر سے دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ فاطمہ کے رخسار نمکین پانیوں سے بھیگ رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی اور اس کے اندر ماتم کی صف بپا تھی۔ شاید صبر کی طنابیں ہاتھوں سے چھوٹ چکی تھیں۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ وہ بلند آواز میں چیخنے لگی۔ وہ اپنے بالوں کو نوچنے لگی۔ رخساروں کو پیٹنے لگی۔ اس کے سارے اختیارات کی حدیں آج ٹوٹ گئی تھیں۔

امر بے بسی سے اسے دیکھتا جارہا تھا۔

فاطمہ رو، رو کر نڈھال ہوگئی۔ چلا چلا کر اس کا حلق خشک ہوگیا۔ چیخ، چیخ کر وہ تھک چکی تھی۔ برسوں سے بہتے آنسوؤں کی ندیاں بھی سوکھنے لگی تھیں۔

اس کی آنکھیں سوج کر پھول گئیں۔ کچنن کے پھل کی طرح لال ہوگئیں۔ وہ جس اذیت سے گزر رہی تھی اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ کسی میں اتنی سکت نہیں تھی۔ اتنی طاقت نہیں تھی کہ فاطمہ کا دکھا ہوا زخمی دل چیر کر دیکھ پاتا۔

وہاں لہو ہی لہو تھا، زخم ہی زخم تھے۔

''اور انہیں اتنے سالوں بعد پتا چلا کہ حورعین کون تھی؟ اور تم کون؟ گو کہ بچوں کے معصوم ذہنوں کو الجھانا غیر مناسب تھا پھر بھی ہمیں بتانا تو تھا ہی...... میں نے انہیں سب کچھ بتایا...... اس انداز میں کہ بچوں کی نفسیات کسی بھی موڑ پر نہ الجھے...... ان کے لیے حورعین بھی ڈریم لینڈ کی فیری تھی اور تم بھی...... ڈریم لینڈ کی ایک فیری چلی گئی اور دوسری فیری آگئی...... یعنی تم...... اگر تم واپس پلٹ کر آئی ہو تو یقیناً بہت کچھ درگزر کروگی...... اپنے لیے نہ سہی، ماہر اور انکل، آنٹی کے لیے سہی...... عون اور محمد کے لیے...... وہ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ فلوریڈا کی پرنسز پاکستان سے واپس لوٹ آئی ہے ہم سب کے لیے...... جو تمہارے اپنے ہیں۔''

امر کی آواز کسی آکٹوپس کی طرح اسے جکڑ رہی تھی۔ اس میٹھے لہجے میں آس بول رہی تھی۔ امید چمک رہی تھی۔ وہ یقین تھا جو ٹوٹنے لگتا بھی تو جڑ جاتا۔

اور امر کو واقعی ایسا ہی یقینِ کامل تھا۔ وہ عون اور محمد کی ماں تھی...... اور مائیں کٹھور دل نہیں ہوتیں۔ مائیں کبھی بچوں سے انتقام نہیں لیتیں۔ اور نہ اپنے بچوں کو آزماتی ہیں۔

اور وہ فاطمہ احسن...... ماہر ارباب کی بیوی نہیں...... عون و محمد کی ماں بن کر واپس آرہی تھی کیونکہ فاطمہ احسن صرف عون اور محمد کی ماں تھی...... صرف عون اور محمد کی۔

☆☆☆

اور پھر نیویارک شہر میں اس روز کا چمکتا سورج ڈھل گیا تھا۔ رینگتی ہوئی رات آئی اور ہر چیز پر چھاگئی۔ یہ پچیس دسمبر کی تاریخ تھی کرسمس کی رات چمکتی روشنیوں نے پورے نیویارک کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ پورا شہر جگمگا رہا تھا۔ پورا شہر گویا جگنوؤں سے بھرا تھا۔ پورا نیویارک دلہن کی طرح سج رہا تھا۔ شاید گوروں کے لیے کرسمس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہ ہو۔ فاطمہ کے لیے تو عید سے بھی اوپر جہانوں کی خوشیاں بے دریغ آسمانوں سے برس رہی تھیں۔

وہ رات جو شبِ برات سے کم نہیں تھی...... وہ رات جو ملن کی رات تھی۔ اس رات فاطمہ کی بلکتی ممتا کو قرار آگیا تھا۔ اس رات فاطمہ کی بے سکون زندگی میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ اس نے ان دو لڑکوں کو دیکھا...... جو اس کے شانوں سے کچھ نیچے تھے۔ پھر بھی اپنی عمر سے بڑے قد...... اونچی اٹھان، صحت مند سراپا لیے ذہین آنکھیں۔ فاطمہ کے دل میں ممتا کی ایسی لہریں اٹھیں جو چودہ سال کے ہر دکھ، ہر اذیت ہر جدائی کو بہا کر لے گئیں۔ یاد رہا تو بس اتنا...... ان دو لڑکوں کے وجود میں فاطمہ کے لیے امان ہے سکون ہے، سرور ہے، خوشی ہے، عمر بھر کا قرار ہے۔

وہ عون اور محمد کو آنکھوں میں بسا، بسا کر نہیں تھک رہی تھی۔ وہ بھی ایسے بلک، بلک کر ملے کہ عمر بھر کی ساری وحشتوں کا ازالہ ہوگیا تھا۔ ان دونوں کے خوب صورت وجود میں گم ہو کر وہ ماموں، مامی کو یکسر نظر انداز کرچکی تھی۔ امر کے بتانے بلکہ جتلانے پر اسے احساس ہوا تھا سو قدرے سنجیدگی سے ماموں اور مامی کو سلام کیا...... گو کہ اس کا انداز کافی روکھا تھا پھر بھی مامی کا جوش کم نہیں ہوا...... وہ بڑی محبت جتلاتے جوش سے فاطمہ سے بھینچ، بھینچ کر ملی تھیں۔ جیسے مامی کے ساتھ فاطمہ کے بڑے اچھے تعلقات رہے ہوں۔ اپنے بیٹے کی ہر زیادتی کا اسے فون کر کر کے اور احوال پوچھ پوچھ کے ازالہ کیا تھا۔

فاطمہ کے دل میں انی سی اتر آئی تھی۔ چاہے کچھ

بھی ہو جاتا...... مامی اور ان کے بیٹے کی دی گئی ذلت کو اتنی آسانی کے ساتھ بھلا دینا ممکن نہیں تھا۔

وہ کیسے بھول جاتی، دن رات کی اس اذیت کو ماہر کے تلخ رویئے کو، حقارت کو، مامی کی بیزاری کو اور اس آخری رسوائی کو...... کیا وہ سب کچھ بھلا دینا واقعی آسان تھا۔

ماموں اسے تڑپ، تڑپ کر روتے دیکھ کر پشیمان اور آزردہ ہو رہے تھے۔

''میری بیٹی! مجھے معاف کردو...... میں تمہارا کوئی حق ادا نہیں کرسکا......'' وہ اس کا سر تھپکتے بہت غم زدہ تھے۔ فاطمہ کو سنبھلنا ہی پڑا۔ آخر اس کی خرابیٔ قسمت میں ماموں کا کیا دوش تھا...... وہ تو اپنا فرض حتی المقدور نبھاتے ہی رہے تھے جہاں تک ممکن ہوا، فاطمہ سے رابطہ رکھا...... تعلق نبھایا...... اسے تسلی دلاسا دیتے رہے...... ماموں بس اتنا ہی تو کرسکتے تھے۔

''مجھے یقین نہیں آرہا...... میں زندگی میں...... بقائمی ہوش و حواس کے ساتھ عون اور محمد کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا......'' وہ اپنے بیٹوں کو خود میں بھینچ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ فاطمہ نے اتنے سال اسی نفرت میں گزارے کہ یہ دونوں اپنے باپ کی طرح ہوں گے۔ ویسے ہی سنگ دل، کٹھور، خودغرض پھر وہ کیوں خود سے اپنے بچوں کے ساتھ رابطہ کرتی...... ان سے ملتی...... وہ اس گمان میں رہی کہ خودغرض باپ کے بیٹے بھی خودغرض ہوں گے۔

لیکن فاطمہ کا یہ گمان غلط ثابت ہوگیا تھا...... وہ ناک نقشے میں اپنے باپ جیسے ضرور تھے مگر عادتوں، مزاج اور طبیعت میں فاطمہ کا دوسرا عکس......

پھر بہت دیر بعد امر نے ملن کے طویل ہوتے پروگرام کو دیکھ کر فاطمہ سے کہا۔

''فاطمہ! ان سے ملو یہ حمنہ ہیں...... عون اور محمد کی بہن......'' امر کے احساس دلانے پر فاطمہ نے گردن موڑ کر کراسنگ ایریا کے انٹرس پر ابھی تک کھڑی اس

بابا جان ہم ادھورے ہیں بہت

زندگی اِک بے اعتبار شے ہے کسی کو خبر نہیں آنے والا وقت ہمارے لیے خوشیوں کی نوید لا رہا ہے یا غموں کا طوفانی ریلہ...... اپنوں کے بچھڑ جانے کا دکھ صرف چند لمحوں کا رونا نہیں یہ تو عمر بھر کا رونا ہے۔ خوشیوں کا موقع ہو یا غموں کے لمحات اپنے بچھڑے ہوئے بہت یاد آتے ہیں۔

12 اپریل اِک قیامت صغریٰ کا منظر، آسمان کیسا کیسا عجب رنگ دکھاتا ہے یا زمین کیسے دہلتی ہے اس دن سمجھ آئی۔ اچانک بالکل اچانک میرے بابا ہم سے بچھڑ گئے۔ جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں مگر اچھے لوگ کبھی بھلائے نہیں جاتے۔ میرے بابا تھے بھی ایسے ناقابلِ فراموش...... ہر اپنے پرائے کے مددگار اور سہارا، با اخلاق، نڈر، بے باک اور بے خوف تن تنہا اپنے حاسدوں اور دشمنوں کے سامنے سینہ سپر رہنے والے۔ ہمیشہ ہمیں حق بات کہنے کی نصیحت کرنے والے۔ آج ہم بہن بھائی جس مقام پر ہیں وہ والدین کی ہی دعائیں اور محنت ہیں۔ ہم بیٹیوں کو کبھی بابا نے بیٹوں سے کم نہیں سمجھا۔ بلکہ ہمیشہ فوقیت دی۔ امی سے اکثر باتیں چھپا جاتی تھیں ہم بہنیں مگر بابا کو اپنی جگہ صورتِ حال سے آگاہ کردیتے تھے ہم بیٹیوں کو جو مان، اعتبار بابا نے دیا میری دعا ہے کہ وہ مان، اعتبار، محبت ہم سدا قائم رکھ سکیں۔ میگزین میں میرا لکھا ہوا جب بھی پبلش ہوتا خوشی و مسرت سے ان کا چہرہ دمک جاتا تھا میرا نام پڑھ کر...... ہر ماہ باقاعدگی سے میرے خطوط ارسال کرتے۔ مجھے خود میگزین لا کر دیتے۔ ہمارا معاشرہ وہ معاشرہ جہاں ڈائجسٹوں کو پڑھنا حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، جہاں بیٹیاں پڑھی لکھی ہونا فضول خیال کیا جاتا ہے ایسے معاشرے کا مقابلہ کرنے والے میرے بابا اپنی ذات میں منفرد ایسے ہی منفرد تھے اپنی تمام فیملی سے یکسر مختلف اور جیسا ہم اولاد کو چاہا امی کی تربیت خاص کی وجہ سے ہم بھی ویسے ہی سامنے آئے میری کتاب اثاثۂ زیست کی اشاعت کے سلسلے میں بابا نے مجھے بہت سپورٹ کیا تھا اور ان کی خوشی دیدنی تھی۔

ہر اک کو خوشی سے بطورِ تحفہ دیتے کہ یہ میری بیٹی نے لکھی ہے اور ہر اک حیران کہ ایسے معاشرے میں اتنی کم عمری میں اتنی پختہ شاعری کیسے ممکن......

بابا جان ہمارے درمیان نہ ہو کر بھی ہمیشہ حیات رہیں گے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے بابا کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں اور دعا کریں اللہ پاک ہم اولاد کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

طلبگارِ دعا، سامعہ ملک پرویز، بھیرہ خان پور ہزارہ

دس سالہ بچی کی طرف دیکھا تھا جو ہنوز پُرشوق نگاہوں سے فاطمہ کی طرف دیکھتی سرخ گلابوں کی ٹوکری اٹھائے کھڑی تھی۔

اس نے سرخ فراک پہن رکھی تھی۔ بالوں میں سرخ ربن لگا رکھے تھے۔ ہاتھوں میں سرخ گلاب پکڑ رکھے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں آس چمک رہی تھی۔ جیسے فاطمہ خود چل کر اس کے پاس آئے گی۔ جیسے فاطمہ عون اور محمد کی طرح اسے خود سے لپٹا لے گی...... اسے بہت پیار کرے گی۔

وہ آنکھوں میں ستاروں کی چمک لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی...... وہ چھوٹی سی بچی نہیں...... ''حورعین'' کھڑی تھی۔ اتنی ہی حسین، مہکتی، خوب صورت کہ نگاہ ٹھہرتی اور جم جاتی...... پھر ہٹتی ہی نہیں...... فاطمہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے قدم ہڈسن پارک کے اس تین منزلہ ریسٹورنٹ کے فرش نے پکڑ لیے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر جیسے جم گئی تھی۔ اس کی سانس تک رک گئی تھی۔ رگوں میں گردش کرتا لہو جیسے جم گیا تھا۔

پھر یوں لگا جیسے در و دیوار گھوم رہے ہیں۔ جیسے زمان و مکان بھول رہے ہیں۔ فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑتی۔ معاً وہ بچی چلتی ہوئی فاطمہ کے قریب آئی۔ اس کی چال میں شہزادیوں کی سی نزاکت تھی، اس کی آنکھوں میں معصومیت تھی، دل کشی تھی، وہ حورعین کی حمنہ تھی...... حورعین جیسی نازک، حسین، دلفریب، ویسی ہی نزاکتوں والی...... فاطمہ کو دوسرا جھٹکا تب لگا تھا جب بچی نے پھولوں کی ٹوکری اس کے پیروں میں رکھی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ فاطمہ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

ایسا والہانہ انداز تھا کہ فاطمہ کا دل بیٹھ گیا۔

حورعین کی بیٹی کا یہ والہانہ انداز اس کے دماغ کی چولیں ہلا گیا تھا۔ اس کے سر پر ریسٹورنٹ کی چھت آن گری...... وہ ننھی بچی نہیں کسی ماہر رقاصہ کی طرح گول، گول گھوم کر گیت سنا رہی تھی۔

پھر وہ گیت کے اختتام پر کورنش بجالائی...... اور بعد میں اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔

''ویلکم ان ڈریم لینڈ ماما۔'' امر، عون اور محمد تالی بجا کر اس کی پزیرائی کرنے کی کوشش میں اسی کے انداز میں کورنش بجالائے تھے۔ پھر امر کی بیوی آمنہ نے اسے گلابوں کا بوکے دیا۔

اگر دیکھا جاتا تو ایسا استقبال بہنوں کا ہی ہوتا ہے اور فاطمہ کا تو دلہن بن کر بھی نہیں ہوا تھا۔ جب وہ فلوریڈا اسے دلہن بن کر ماموں کے گھر آئی تھی۔ اس وقت کو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

وہ حورعین کی بیٹی حمنہ کو دیکھ کر اس قدر شاکڈ تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو سہلا بھی نہیں سکی۔ ویسے بھی حمنہ کی طرف اس کا ہاتھ بڑھ ہی نہیں سکا تھا۔ اس کا ظرف اور دل تنگ پڑ گیا...... وہ حمنہ کی پزیرائی نہیں کر سکی۔ کیونکہ وہ حمنہ کی پزیرائی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی پھر فاطمہ نے پورا رستہ دیکھا ہی نہیں اس ننھی بچی کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ اور اس کی چمکتی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ سپر لگژری کیمری میں موجود کسی بھی فرد نے دھیان نہیں دیا تھا۔ حورعین کی بیٹی سب سے نظر بچا کر چپکے، چپکے آنسو بہا رہی تھی۔

☆☆☆

''اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں...... کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے اس کے پاس پانے کے لیے پوری دنیا ہوتی ہے۔''

خالہ نے ایک مرتبہ فاطمہ کو بڑے جذب کے ساتھ سمجھایا تھا۔ اس وقت فاطمہ کو خالہ کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ دراصل وہ وقت انتہائی مایوس کُن تھا...... فاطمہ کو کوئی روزن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی رستہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ خود کو ایک بند گلی میں کھڑا پاتی تھی۔ جہاں پہ نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی دروازہ...... نہ روشنی تھی نہ ہوا...... وہ سب کچھ لٹا کر آئی تھی...... وہ اپنا قیمتی سرمایہ ہار کر آئی تھی۔ اس کا صدمہ، اس کا غم کوئی معمولی نہیں تھا۔ زندگی میں ہار جانا اتنا اذیت ناک نہیں ہوتا، جس قدر ٹھکرایا جانا درد ناک ہوتا ہے۔

انسان ہار جانے کی ذلت بھول جاتا ہے مگر ٹھکرائے جانے کی ذلت بُھلا نہیں پاتا۔

پھر فاطمہ کے تو دُہرے نقصان ہوئے تھے...... وہ دُہری اذیتوں میں مبتلا تھی...... اس کا گھر تو ٹوٹا ہی تھا، بچے بھی چھوٹ گئے...... اپنا وطن، جگہ اور جائے پیدائش تک چھوڑنا پڑی۔

وہ گھر سے بے گھر ہوگئی تھی۔ وطن سے بے وطن ہوگئی تھی۔ اس کے سارے رشتے دار اور تعلق ختم ہوگئے تھے یہاں تک کہ بچے بھی بچھڑ گئے تھے۔

تب خالہ تڑپ کر راتوں کو روتی ہوئی فاطمہ کو ایک چیز سمجھاتی تھیں۔

''یہ زندگی ہماری خواہشات کے مطابق نہیں ہوتی...... جہاں ہماری پسند کی چیز ہمیں میسر نہ آئے یا کھو جائے...... صبر وہاں کام آتا ہے۔'' خالہ جب تک زندہ رہیں اسے صبر کے سبق ہی پڑھاتی رہی تھیں۔ اور صبر تھا کہ آتا ہی نہیں تھا...... بہت سال وہ صبر کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔ صبر کی رمزیں سیکھتی، صبر کا قرینہ سیکھتی...... پھر بھی صبر سمجھ میں نہیں آتا تھا پھر جب بہت سا وقت گزر گیا...... ماہ و سال کا شمار کرنا ترک کیا۔ رستے زخموں پر پھاہے رکھے تو صبر کی پہیلی خود بخود سمجھ میں آگئی۔ اس نے صبر کو بچھونا بھی بنایا اور اوڑھ بھی لیا...... سو زندگی کے دن ویران ہی سہی مگر گزرتے چلے گئے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا اور وقت اتنا آگے نکل گیا۔

زندگی کے اتنے سال چپکے سے نکل گئے...... وہ پوروں پر حساب رکھتی تو اس کی شادی کو قریب چودہ سال ہو چکے تھے اور علیحدگی کو دس سال......

وہ پورے دس سال بعد ایک مرتبہ پھر ماموں کے اسی کاٹیج میں گھوم رہی تھی۔ جس کے چپے، چپے پر پُراذیت یادیں بکھری تھیں۔ فاطمہ کے آنسو بکھرے تھے۔ اس کی آہیں بکھری تھیں۔

یہ ماموں کا وہی کاٹیج تھا جو اس کے لیے برزخ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آج اسی کاٹیج میں فاطمہ پورے استحقاق سے گھومتی تھی اور کوئی اسے ٹوکنے والا نہیں ہوتا تھا۔

ماموں تو پہلے بھی مداخلت نہیں کرتے تھے...... ہاں مامی اور ماہر تو تھے ناں...... جو اس کے لیے سراپا جلاد تھے۔ وہی ماہر اسے دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ بولنا ہی بھول گیا۔ شاید اس کے گمان میں تھا۔ فاطمہ مڑ کر آئے گی ہی نہیں...... اور شاید فاطمہ کبھی نہ آتی۔ عمر بھر کے لیے اس پر لعنت بھیج دیتی۔

اگر وہ صرف ماہر کی بیوی ہوتی تو کبھی بھی اس گھر پر تھوکتی بھی نہیں۔ فاطمہ کو لوٹنا تو اس لیے پڑا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں سے مزید جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے رستوں میں عون اور محمد کھڑے تھے۔ وہ کس، کس موڑ پر انہیں نظر انداز کرتی؟ وہ کس، کس موڑ پر انہیں دیکھ کر منہ موڑ لیتی؟ یہ کام ایک سنگ دل باپ تو کر سکتا ہے مگر ایک مر مٹ جانے والی ماں نہیں کر سکتی۔

اور آج پورے دس سال بعد وہ پھر ماہر کی راج دھانی میں موجود تھی...... اور پورے اعتماد اور استحقاق کے ساتھ تھی کیونکہ پہلے اور اب کے وقت میں، سورج اور چاند جتنا فرق تھا...... دھوپ اور بادلوں جتنا فرق تھا۔ رات اور دن جتنا فرق تھا۔

حتیٰ کہ مامی بھی اس کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتی تھیں۔ وہ جو مرضی کرتی جیسی مرضی کوکنگ کرتی، ناپسندیدگی یا تنقید کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور ماہر بھی خاموش ہی رہتا۔

فاطمہ کو وہ وقت بھی یاد تھا جب ایک صبح اس نے ناشتے کی میز سجا کر مامی اور ماہر کو آواز دی تھی۔ وہ شادی کی پانچویں صبح تھی۔ کوکنگ میں اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بہت محنت و خلوص سے ناشتا بنا رہی تھی۔

گو کہ اسے یہ سمجھ بوجھ نہیں تھی کہ ماہر کے دل کا رستہ نہ معدے سے ہو کر آتا ہے اور نہ ہی کسی اور سمت سے...... وہ بس بڑی لگن سے ناشتا بنا رہی تھی۔ بالکل اپنی ماں کی طرح...... اس کی ماں بھی پاپا کے لیے اتنی ہی لگن سے ناشتا بناتی تھیں لیکن پاپا کا رویہ ممی سے بڑا ہتک آمیز ہوتا تھا۔ وہ کھانے کی پوری ٹرے کو جب دل چاہتا الٹ دیتے تھے۔ فلوریڈا میں اس کی ممی کے گھر

جیسا کوئی گھر نہیں ہوگا۔ اور اس کی ممی جیسی بھی کوئی ممی نہیں ہوں گی۔ فاطمہ کی ممی نے کبھی شوہر کی مار پیٹ اور بدتمیزی پر مشتعل ہو کر پولیس نہیں بلوائی تھی۔ کم از کم فاطمہ نے اپنے ہوش میں کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔

اس طرح پاپا کے جیسا کوئی بدتمیز شوہر فاطمہ نے پورے فلوریڈا میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھتی تھی پوری دنیا میں صرف پاپا جیسا ایک ہی مرد ہے...... انتہائی ال مینرڈ...... اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اس کے پاپا سے بڑھ کر بھی ایک مرد موجود ہے، جو اُن سے بدتہذیبی میں چار ہاتھ آگے تھا۔ پاپا غصے میں پوری ٹرے الٹ دیتے تھے اور ماہر غصے میں پوری میز الٹ دیا کرتا تھا۔ اس کا پہلا تجربہ فاطمہ کو شادی کے پانچویں روز ہوا تھا۔ جب ماہر کو ناشتا پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک، ایک چیز کو سونگھا اور میز الٹ دی۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ فاطمہ سہم کر چیخ پڑی تھی۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ پھر بھی ماہر کو رحم نہیں آیا تھا۔ وہ اگلے بیس منٹ تک چلّا رہا تھا۔ پھر اپنے میڈیکل اسکول چلا گیا۔ مامی آرام سے تماشا دیکھتی رہی تھیں۔ انہوں نے ماہر کو ٹوکا ہی نہیں تھا۔ الٹا ماہر کے جاتے ہی برس پڑیں۔

"کیا اتنا بدذائقہ کھانا پکاتی ہو؟ تبھی ماہر نے میز الٹ دی۔ تمہاری وجہ سے اتنا نقصان ہوا ہے۔ میز کا شیشہ بھی ٹوٹا اور برتن بھی...... تمہاری سزا ہے تم گھر کا سارا کام کرو گی، ڈرائیو وے سے برف بھی ہٹاؤ گی۔" یہ مامی نے محض ٹریلر دکھایا تھا۔ پھر پوری فلم تو ہنی مون سے پہلے ہی چل پڑی تھی۔ مامی کے نخریلے ماہر کو کچھ پسند نہیں آتا تھا۔ وہ پلیٹیں، گلاس، چمچے اٹھا، اٹھا کر نیچے پھینکتا تھا۔ غصے میں چلّاتا، گالیاں دیتا اور دہاڑتا رہتا تھا۔

پھر فاطمہ کو کچھ ہی عرصے بعد پتا چلا کہ ماہر کو اس کے ہاتھ کا کچھ بھی پسند نہیں تھا بلکہ سرے سے فاطمہ ہی پسند نہیں تھی۔ وہ اسے بھوتنی، کالی، بھدّی اور نہ جانے کیا، کیا کہتا تھا۔

سوچوں کا طویل سلسلہ اسے پھر سے بھٹکا رہا تھا۔ معاً وہ عون کی آواز پر حال کی دنیا میں لوٹی تھی۔

اس وقت سب فاطمہ کے ہاتھ کا بنا کھانا کھا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ کا ذائقہ پہلے جیسا ہی تھا۔ شاید ان سب کے ٹیسٹ بدل گئے تھے۔

اس کے بچے تو بہت رغبت سے کھانا کھا ہی رہے تھے مامی اور ماہر بھی خاموشی سے کھاتے رہے...... بغیر ناک چڑھائے...... ماتھے پر شکن لائے بغیر......

"شاید حورعین نے ماہر اور مامی کی عادتیں بدل دی تھیں۔" اس نے تلخی کے ساتھ سوچا پھر خالی برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

اسے دس سال بعد ایک مرتبہ پھر ماہر کی سلطنت میں آئے ہوئے آج آٹھواں دن تھا۔ وہ بہت جلدی اپنے بچوں کی پسند ناپسند کو جان گئی تھی۔ وہ کیا کھاتے تھے، کیا پہنتے تھے؟ فاطمہ کو چند دنوں میں ازبر ہو چکا تھا۔

وہ بڑی لگن، محنت اور چاہت سے کوکنگ کرتی رہی تھی۔ خالہ نے اسے پاکستانی کھانوں میں بھی طاق کر دیا تھا۔ گو کہ وہ اب بھی بہت لذیذ کھانا نہیں بناتی تھی پھر بھی اس کے بچے بے انتہا تعریف کرتے تھے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی سہ پہر تھی۔

وہ کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی...... اس نے کریلوں کے ساتھ سبزی کا رائتہ بنایا تھا۔ اور سویٹ میں ایپل پائی...... عون اور محمد پاکستانی فوڈ کے زیادہ شوقین تھے۔

جب اس نے رات تک کا کھانا بنا لیا...... تب میز بھی سجا دی تھی۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا تھا، بچے ماہر کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ وہ اس کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ خاص طور پر حورعین کی حمنہ...... وہ تو پانی تک نہیں پیتی تھی۔ فاطمہ کو حیرانی ہوتی...... اپنی ماں والے سارے گُر اسے ازبر تھے۔ ساری اداؤں اور چالاکیوں سے واقف تھی۔ باپ کو کس، کس طرح خود تک محدود رکھنا ہے اپنی طرف متوجہ یا مصروف رکھنا ہے۔ وہ اتنی سی بالشت بھر کی لڑکی کو دیکھ، دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔

جب اس نے ڈنر سرو کیا...... تب کریلوں کو دیکھ کر ایک مرتبہ تو ماہر کے چہرے پر استعجاب اترا تھا اسی

طرح حمنہ کے تاثرات میں بھی ناپسندیدگی نظر آئی۔ جبکہ عون اور محمد کے ساتھ مامی بھی بے نیازی سے کھانا کھا رہی تھیں۔ گویا انہیں بھی کھانے پر اعتراض نہیں تھا۔ پھر ماہر اور حمنہ کے تاثرات ایسے کیوں تھے؟ فاطمہ کو اندر ہی اندر کھد بدی ہوئی...... لیکن وہ ماہر کے سامنے اسے مخاطب کرنا نہیں چاہتی تھی۔

بیٹی کو بے دلی سے کھانا کھاتے دیکھ کر ماہر سے رہا نہیں گیا...... اور شاید اس کی آمد کے پچیسویں دن ماہر نے خود فاطمہ کو مخاطب کیا تھا وہ بھی اپنی نخریلی بیٹی کے لیے...... فاطمہ کے اعصاب کھنچ سے گئے تھے۔

"اس کو چیز آملیٹ بنا دو......" ماہر نے حمنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...... وہ مخاطب فاطمہ سے تھا مگر دیکھ حمنہ کی طرف رہا تھا۔ حمنہ بھوکی رہے...... یہ اسے گوارا کہاں تھا...... کیونکہ وہ جانتا تھا حمنہ نان ویجیٹرین ہے۔ اسے سبزیاں پسند نہیں تھیں جبکہ ماہر دیکھتا تھا لنچ یا ڈنر میں سبزی ضرور ہوتی تھی...... اور اس کے ساتھ ہی کوئی اضافی آئٹم نہیں ہوتا تھا۔ حمنہ بنا ناپسندیدگی دکھائے چپ چاپ کھانا کھا لیتی تھی...... یہ اس کی بہت اچھی عادت تھی۔ وہ کوئی نخرہ یا اعتراض نہیں کرتی تھی لیکن حمنہ خود پر جبر کرے؟ یہ ماہر کی برداشت سے باہر تھا۔

اتنے دن ہو چکے تھے...... وہ خود سب دیکھ رہا تھا فاطمہ، عون اور محمد سے مینیو پوچھتی تھی۔ ان کی پسند کا کھانا بناتی تھی مگر حمنہ سے کچھ بھی پوچھنے کا تردد اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی حمنہ نے خفگی دکھائی تھی۔ نہ باپ سے شکایت کی...... وہ ایسی ہی فرمانبردار بچی تھی۔ وہ بہت امن پسند بچی تھی۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہتی...... اسے پتا تھا وہ باپ سے شکایت کرے گی تو گھر میں لڑائی ہو گی۔

جب مامی، عون اور محمد اٹھ کر چلے گئے تب ایک مرتبہ ماہر نے فاطمہ سے کہا۔

"حمنہ کو کچھ بنا دو...... وہ بھوکی رہے گی...... کھانا نہیں کھا رہی...... اسے سبزی پسند نہیں آئی۔" ماہر کی آواز سن کر ایک مرتبہ پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ حمنہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ فاطمہ کو پوری ایکٹرنگ رہی تھی۔

وہ غائب دماغی سے ماہر کو دیکھتی رہی۔ جیسے اس کی بات سمجھنا چاہ رہی ہو...... ماہر اندر ہی اندر زچ سا ہونے لگا۔ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔

"حورعین نان ویجیٹرین ہے، مجھے پتا نہیں تھا...... نہ اس نے کبھی بتایا۔" فاطمہ نے خاصی سنجیدگی دکھائی۔ ماہر پانی پیتے، پیتے چونک گیا۔

"حورعین؟" اس کی آنکھوں میں استعجاب اتر آیا تھا۔ پھر اس نے حمنہ کی طرف دیکھ کر جتلایا۔

"حورعین نہیں، حمنہ...... اس کا نام حمنہ ہے۔"

"اچھا...... میرے ذہن سے نکل گیا......" فاطمہ نے غائب دماغی سے سر جھٹک دیا تھا۔ ماہر کے ہونٹوں پر طنز پھسل پڑا۔

"تمہارے حواسوں پر حورعین ہی سوار ہے۔ اور ہمیشہ سے سوار ہے۔"

"اور آپ کے؟" اس کا سوال بڑا کرارا قسم کا تھا کچن کی طرف بڑھتا ماہر لمحے بھر کے لیے رک گیا۔

"ظاہر ہے میرے بھی۔" وہ کچھ اور جواب دینا چاہتا تھا مگر بات بدل گیا۔ اچھا تھا کلستی رہتی۔ اتنا نخرہ دکھا رہی تھی حد نہیں...... ایک آملیٹ بنانا تھا یا ہڈسن میں تیرنا تھا...... حد تھی اور واقعی حد تھی...... وہ غصے میں فرائنگ پین میں آئل ڈالنے لگا۔

اور فاطمہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

تو وہ آج تک اور ابھی تک حورعین کا ہی اسیر تھا۔ اسی کا عاشق، اسی کے عشق میں گرفتار...... فاطمہ کے اندر الاؤ بھڑ کنے لگا تھا، شعلے پھیلنے لگے تھے اور حورعین آج بھی ان کے درمیان تن کے کھڑی تھی۔ کسی پہاڑ کے مانند جسے عبور کرنا کم از کم فاطمہ کے بس کا کمال نہیں تھا۔ اس کے پورے وجود پہ تھکن اتر آئی۔ افسردگی اتر آئی۔ رنجیدگی اتر آئی۔ دل چاہ رہا تھا۔ واپس کسی اندھے رستے کی طرف مڑے اور کھائی میں

جاگرے یا کسی دریا میں کود جائے۔ جہاں نہ ماہر ہو اور نہ ماہر کی حورعین......

یہ دونوں فاطمہ کی زندگی کے ناسور تھے۔ عذاب تھے، زخم تھے، ناآسودگی کا برزخ تھے۔ وہ جانے کب تک برف کے مانند جمی رہتی۔ معاً حمنہ کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

''ماما! ڈیڈی کو چیز آملیٹ نہیں بنانا آتا...... وہ کنفیوزڈ ہیں۔'' حمنہ نے بھیگی نمناک آواز میں کہا تھا۔ جیسے باپ کی مشکل پر وہ سخت بے چین تھی۔ فاطمہ اچھی بھلی ششدر رہ گئی تھی۔ کیونکہ حمنہ کا انداز انتہائی شائستہ تھا، وہ اتنی سی بچی کی حسیات پر سخت متعجب تھی۔

فاطمہ نے چونک کر اوپن کچن میں دیکھا...... فرائنگ پین جل، جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور ماہر جانے کون سا مسئلہ حل کرنے کے لیے سوچوں میں مستغرق تھا۔

فاطمہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر حمنہ کو بری طرح سے جھڑک دیا۔

''اتنا باپ کا خیال ہے تو خود کرلو...... میری جان چھوڑو...... میں تمہارے باپ کی نوکر نہیں......'' اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہوگئی تھی۔ یوں کہ ماہر تک ٹھٹک کر مڑا تھا اور حمنہ بھی ڈر کر سہم گئی تھی۔ اس کا انداز خاصا جارحانہ تھا۔

ماہر کی چبھتی نگاہوں کی تپش پا کر وہ الٹے قدموں اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ جاتے، جاتے اس نے حمنہ کے چکنے گلابی گالوں پر آنسو بکھرتے دیکھے تھے۔ لمحے بھر کے لیے فاطمہ کو اپنے روڈ رویے پر افسوس ہوا پھر وہ سر جھٹک کر اندر چلی گئی کیونکہ ماہر کی نظروں میں کچھ ایسا تاثر ضرور تھا کہ جس نے فاطمہ کے دل کو اٹکا دیا۔ جیسے اسے امید نہیں تھی کہ فاطمہ، حمنہ کے ساتھ اتنا روڈ بی ہیویئر رکھے گی۔

پھر اس ساری رات فاطمہ کو نیند نہیں آئی۔ وہ پوری رات جاگتی رہی، سوچتی رہی...... جیسے ضمیر کی چبھن کا شکار ہو جیسے ساری رات حمنہ کے آنسو اسے بے چین کرتے رہے ہوں۔ پھر بھی وہ حورعین کی طرح خود کو کٹھور ہونے کا درس دے کر مضبوط کرتی رہی تھی۔ آخر حورعین نے گیارہ سال اس کے شوہر پر قبضہ جما کر اسے جلاوطن کیے رکھا تھا۔ اگر حورعین بے حس تھی تو فاطمہ بھی اس کی بیٹی کے لیے اتنی ہی بے حس ہوسکتی تھی۔

☆☆☆

چودہ سال پہلے وہ فلوریڈا سے نیویارک آئی تھی۔ پھر چار سال سے بھی کم مدت کے بعد ذلت اور رسوائیوں کے داغ لے کر پاکستان چلی گئی۔

اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟ وہ فلوریڈا واپس کیوں نہیں گئی؟ فاطمہ آج بھی اسی سوال کے گرد گھومتی تھی۔

ماہر کی بے وفائی کا صدمہ لے کر اسے فلوریڈا جانے سے امر نے روکا تھا۔ وہی تو تھا جس نے بھاگ دوڑ کر کے فاطمہ کا پاسپورٹ بنوایا تھا۔ پاکستان کا ویزا لگوایا تھا۔

یہ امر کی خواہش تھی کہ فاطمہ پاکستان چلی جائے...... وہاں جا کر حورعین کی ماں یعنی اپنی خالہ کو اس کے کرتوت بتائے...... کیا خبر اس کی ویران اور اجڑی زندگی کی کہانی سن کر خالہ کو جلال آجائے...... وہ امریکا پہنچ کر ماہر اور حورعین کی طلاق کروادیں۔

تب فاطمہ کو بھی یہی مناسب لگا تھا...... پھر فلوریڈا میں اس کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا اپنے بے حس باپ کے پاس وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی تعلیم اس کے پاس نہیں تھی۔ ہنر کوئی آتا نہیں تھا۔ نہ کوئی جاب تھی، نہ فنانشلی اسٹرانگ پوزیشن تھی...... اسے پتا تھا کہ پاکستان میں اس کی خالہ بہت امیر ہیں...... کم از کم فاطمہ کو رہنے کے لیے چھت اور عزت کی روٹی تو ضرور ملے گی۔ اس سے زیادہ کی اسے چاہ نہیں تھی۔

وہ پاکستان تو چلی آئی...... خالہ کو اپنی دردناک کہانی بھی سنائی۔ خالہ نے اس غم کو سر پر سوار بھی بہت کیا...... اسپتال جا پڑیں۔ حورعین سے قطع تعلقی کرلی...... اور قسم کھائی کہ زندگی بھر اس سے کلام نہیں کریں گی...... حالانکہ فاطمہ نے بہت زور دیا تھا۔ بہت کوشش کی...... خالہ امریکا جائیں...... بیٹی سے پوچھیں...... اسے غیرت دلوائیں...... ماہر کو مجبور کریں، وہ اسے طلاق دے...... مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ خالہ نے حورعین سے بات ضرور کی تھی مگر اس کے بعد وہ چپ سی ہوگئی تھیں۔

انہوں نے پھر حورعین کو برا بھلا نہیں کہا تھا۔ بلکہ ایک چپ کی بکل میں گم ہوگئیں۔ فاطمہ نے لاکھ سر پیٹا مگر جواب ندارد تھا۔ وہ اسے صبر کرنے کا بس مشورہ دیا کرتی تھیں۔

حالانکہ امر بھائی کے کہنے پر فاطمہ نے رو، رو کر سارا واقعہ بار، بار خالہ کو سنایا تھا۔

''صرف اپنے عشق کی آگ بجھانے کی خاطر ماہر نے مجھے بدکردار کہا...... عیاش کہا...... کال گرل کہا...... اور بچے چھین کر مجھے گھر سے نکال دیا...... مجھے ہر رشتے سے بے دخل کردیا...... صرف اس حورعین کی وجہ سے...... آپ کی بیٹی نے میرا گھر اجاڑ دیا......'' وہ ساری، ساری رات روتی اور تڑپتی تھی...... اسے غم کے لمبے، لمبے دورے پڑتے...... بہت سال وہ دنیا سے کٹی رہی...... یہ خالہ کی کوششیں اور بدعائیں تھیں جو رنگ لائی تھیں اور فاطمہ بہت سال کے بعد کچھ سنبھل گئی تھی۔

اس وقت وہ کاٹیج کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ یہاں سے امریکی ہائی وے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ دنیا کا بہترین ٹریفک نظام امریکا میں دکھائی دیتا۔ جگہ، جگہ سائن بورڈوں پر شہروں، قصبوں اور ریاستوں کے میں بارے میں لکھا ہے۔ کوئی بھی اجنبی محض نقشے کی مدد سے پورے امریکا کی سیر کرسکتا ہے۔ کسی سے رستہ پوچھنے کی کبھی ضرورت نہیں۔

لیکن فاطمہ ایک ایسی امریکی لڑکی تھی جو نقشے کو پکڑ کر بھی اجنبیوں سے اپنے ہی گھر کا رستہ پوچھتی پھرتی...... چاہے کوئی ٹھیک بتاتا یا غلط...... فاطمہ کو اندھا دھند دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے کی عادت تھی...... ایک بات تو سچ تھی...... اس نے کبھی اپنی عقل کا استعمال نہیں کیا تھا۔ اسی لیے ماہر اپنی ماں پر چلاتا رہتا تھا۔

''کس احمق اور بدھو کو میرے ساتھ باندھ دیا...... اس میں عقل نام کی نہیں...... اتنی احمق اور گاؤدی ہے...... کسی بات کا پتا نہیں چلتا...... فلوریڈین گائے ہے۔'' ماہر کی بازگشت آج بھی فاطمہ کو سالوں پیچھے لے جاتی تھی۔ تب بھی وہ احساسِ توہین پر روپڑتی...... چیخ اٹھتی اور پاگل ہو جاتی تھی۔

اور جب وہ صدمے کی انتہا پر بھاں، بھاں کر کے روتی تب بھی ماہر کا پارہ آسمان پر چڑھ جاتا......

''اس کو رونے کا بھی سلیقہ نہیں...... کوئی ایسے

رونے کا فائدہ

امریکا کے ایک ممتاز ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ولیم فیری نے اپنی طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا ہے کہ آنسوؤں کا انسان کی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ان کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ جذباتی دباؤ کے وقت انسانی جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور جسم کے اندر مختلف غدودوں سے خاص مواد نکل کر خون میں شامل ہو جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ رونے کے بعد انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر فیری کا خیال ہے کہ جذباتی دباؤ کے نتیجے میں جسم میں کیمیاوی عمل ہوتا ہے۔ وہ آنسوؤں کے ذریعے زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ روتے نہیں ہیں وہ مختلف قسم کے امراض میں بالخصوص السر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے تحقیق کی ہے کہ عورتوں کی نسبت مرد زیادہ السر کے مریض ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جذباتی آنسو، پیاز کے ذریعے بہنے والے آنسوؤں سے کیمیاوی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے سو افراد کو پیسے دے کر ان کے آنسو حاصل کیے اور ان پر مختلف تجربے کیے ہیں۔

مرسلہ: ماریہ عقیل، لاہور

روتا ہے؟ آخر حورعین بھی تو ہے ناں...... وہ تو ایسی نہیں...... وہ تو بالکل ایسی نہیں...... آپ کو یہ الو کی دم ملی تھی میرے لیے...... کیا حورعین دکھائی نہیں دی......؟'' ماہر جب بولنے پر آتا تو ذرا بھی لحاظ نہیں رکھتا تھا۔ ایسے، ایسے فضول الفاظ کا استعمال کرتا تھا کہ بندہ مٹی تلے گھس جانے کی خواہش کرنے لگتا۔

پھر ماہر کو اس کی عمر پر بھی اعتراض تھا۔ اسے میچور لڑکیاں پسند تھیں۔ حورعین جیسی...... فاطمہ کم عمر تھی...... اسے ڈریسنگ کرنے کا، کوکنگ کا، گھر سنوارنے اور شوہر کا دل جیت لینے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ جانے وہ کون عورتیں ہوتی ہیں جنہوں نے اتنے، اتنے دیو ہیکل شوہروں کو بھی دام میں کر رکھا ہوتا ہے۔ ایک فاطمہ تھی اسے شوہر کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کا بھی طریقہ نہیں آتا تھا۔

اوپر سے مامی اس کی انسلٹ پہ بہت خوش ہوتی تھیں۔ اصل میں حورعین انہیں بھی پسند تھی اور فاطمہ کی پوری فیملی کو وہ سخت ناپسند کرتی تھیں۔ شاید اس کے پاپا کی وجہ سے ورنہ اس کی ممی تو آئیڈیل ماں بلکہ آئیڈیل عورت تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند، شرمیلی، نیک اور دیو...... انہوں نے فاطمہ کی تربیت بھی ایسی ہی کی تھی، یہ خبر نہیں تھی کہ ان کے بھتیجے کو ایسی لڑکیوں سے انتہائی چڑ اور نفرت تھی۔

وہ بااعتماد اور باوقار لڑکیوں کو پسند کرتا تھا۔ جو سوبر ہوں، دھیما بولیں، کسی بھی پرابلم کو سولو کرنے کے پہلو سوچیں ناں کہ چیخ، چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیں۔ اسے جذباتی اور اعصابی طور پر مضبوط، پاور فل اور اسٹرانگ خواتین اچھی لگتی تھیں جبکہ فاطمہ میں ایسی کوئی بھی خوبی نہیں تھی۔

وہ خود سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اگر کوئی اسے مشورہ دیتا، اچھا یا برا تو وہ اس پر آنکھ بند کر کے اعتبار کر لیتی...... دل و جان سے عمل کرنے کی کوشش کرتی...... خود سے اس کے اچھے، برے پہلو پر غور نہیں کرتی تھی۔

اس کی ممی نے بہت حد تک اسے محتاج بنا ڈالا تھا۔ وہ کبھی اکیلی گھر سے اسکول تک نہیں گئی تھی۔ ممی نے اسے سہیلیاں بھی بنانے نہیں دیں۔ اسے اسٹور تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے تئیں ممی اسے ارد گرد کے بے باک ماحول کی پرچھائیوں سے دور رکھتی تھیں۔ یہ خبر نہیں تھی کہ بیٹی میں اعتماد ختم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ماہر جیسے بندے کے ساتھ کس طرح سے رہے گی؟ کیسے گزارہ کرے گی؟ نیویارک کی کھلی سڑکوں کو دیکھتی وہ فلوریڈا میں ممی کے پہلو سے جاچکی......

''اُف یادیں اور رُلا دینے والی یادیں......'' ممی کی یاد نے اسے نمناک کر دیا تھا۔ جیسے ہی اس نے گردن گھمائی پیچھے ماہر کو کھڑا دیکھ کر حواس باختہ ہونے کے بجائے اکڑ گئی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ ماہر اس کی تلخ کلامی پر باز پرس کرنے آیا ہے۔ مگر وہ ہوتا ہے کون تھا باز پرس کرنے والا؟ دس سال پہلے اس کی ناک تلے عشق کا کھیل رچا کر، اپنی محبوبہ سے ایک بچی پیدا کر کے آج بھی اتنا تن کے کھڑا تھا۔ جیسے اسے اپنے کسی بھی عمل پر پشیمانی نہیں تھی۔

جیسے اسے اپنی پہلی بیوی کو گھر سے دھتکارنے اور بچے چھین لینے پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ اگر وہ اپنے بچوں کی خاطر اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آ ہی گئی تھی تو کم از کم ماہر کا فرض تو بنتا تھا۔ فقط ایک لفظ معذرت اور شرمندگی کا اس کی سماعتوں میں اتار دیتا لیکن فاطمہ کو لگتا وہ اس کے لوٹ آنے پر کچھ اور اکڑو خان بن گیا تھا...... اندر ہی اندر جانے کتنا مسرور ہے...... ایک بیوی کو دھتکار کر، دوسری شادی بھی رچالی...... بیٹی بھی ہوگئی...... اور محبوبہ کے مر جانے کے بعد پہلی بیوی نے گھر بھی آ کے سنبھال لیا...... کتنے مزے تھے ان مردوں کے جو یورپی ہوتے ہیں یا پاکستانی...... ویسے بھی پاکستانی مغرب کے ماحول میں پیدا ہو کر بھی ذہنی طور پر رہتے پاکستانی ہی ہیں، وہی بیویوں کو نیچا دکھانے والی پرانی اور گھٹیا برصغیرانہ غلام قسم

کی سوچ......

اس وقت فاطمہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے ماہر کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر کافی دیر بعد ماہر کو خود ہی بولنا پڑا...... شاید وہ فاطمہ کی پہل کا انتظار کر رہا تھا۔

''حمنہ کے ساتھ اتنا روڈلی بی ہیو کرنے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بہت کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ فاطمہ کے اعصاب بھی تن گئے تھے۔ حمنہ کے لیے اس کی چاہت پہ وہ شدید جلن محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ ایک بچی سے کیا حسد کرنا؟ لیکن وہ اپنی کیفیات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''میں ایسی ہی ہوں۔'' اس نے اپنے تئیں بڑا تنک کر کہا تھا...... ماہر کو شاید ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے چپ کر گیا تھا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم میں کچھ تبدیلی آ چکی ہے لیکن تم تو وہی ہو...... میں نے ہی تمہیں دوبارہ بلوا کر غلطی کی......'' اس کے انداز میں تاسف بھر گیا تھا۔ اور فاطمہ کے تو سر پہ جا لگی تھی...... اس کی آنکھیں احساسِ توہین سے لال ہوگئیں۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' فاطمہ نے غصے سے کہا۔

''بہت خوب، مطلب بھی میں ہی سمجھاؤں تمہیں...... اپنا کیا دھرا بھول چکی ہو...... جو کچھ تم نے کیا...... وہ ایسا شرمناک تھا کہ تمہیں تو میرے سامنے اتنا اکڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بھی سو مرتبہ سوچنا چاہیے تھا۔ مگر تم اپنے انگریز بے مذہب اور بے دین باپ کی طرح ڈھیٹ اور بے غیرت ہو۔'' ماہر کے الفاظ نے فاطمہ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا۔ آنکھیں آگ برسانے لگیں۔

''جسٹ شٹ اپ......'' وہ چلا اٹھی تھی۔

''چلاؤ مت فاطمہ...... میں خود بھی ماضی کو دُہرانا نہیں چاہتا...... اور ایسا قابلِ فخر ماضی ہے بھی نہیں...... جسے اچھے دنوں کی طرح یاد کیا جائے...... اگر میں سب کچھ بھلا چکا ہوں تو تم بھی پچھلی باتیں بھول جاؤ۔

بہتری اسی میں ہے...... اور باقی یہ ہے کہ حمنہ کے ساتھ برتاؤ میں تبدیلی لاؤ...... وہ اتنی سمجھدار نہیں جو تمہاری تلخی کو برداشت کر سکے۔'' ماہر کا لہجہ اب بھی روکھا اور کھردرا تھا۔

''میں نے حمنہ کو کیا کہہ دیا؟'' وہ اب کی دفعہ کچھ پست آواز میں بولی۔

''جو کہا ہے اب ایسا مت کہنا...... میری بیٹی بہت ہی حساس ہے۔'' ماہر نے جیسے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔ پھر نپے تلے قدم اٹھاتا پلٹ گیا۔ جبکہ فاطمہ ہونٹ کاٹتی غصے میں بڑبڑاتی رہ گئی۔

☆☆☆

ماہر سے اس دن کی تلخ کلامی کے بعد دوبارہ بات نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ حمنہ کے حوالے سے ماہر کی شکایات دور ہو چکی تھیں۔ فاطمہ خاص طور پر ماہر کی موجودگی میں جتا، جتا کر حمنہ سے پوچھتی تھی۔

''آج لنچ میں کیا ہو؟ یا ڈنر میں کیا بناؤں؟'' وہ واضح طور پر ماہر کو سنا کر حمنہ کو مخاطب کرتی تھی جواباً حمنہ اپنا فرمائشی پروگرام بے تکلفی سے نشر کر دیتی۔ فاطمہ نے ایک بات شدت سے نوٹ کی تھی۔ حمنہ بہت زیادہ فاطمہ کے قریب ہونا چاہتی تھی۔ وہ بہانے، بہانے سے فاطمہ کو متوجہ کرتی...... اس سے پیار لینے کی کوشش کرتی اور پھر بہت لاڈ سے گلے میں بانہیں ڈال کر جتاتی۔

''ماما......! آپ میری پرنسس ہیں۔'' اکثر لاڈ کے یہ مظاہرے ماہر کے سامنے ہونے لگے تھے۔ اور وہ ٹی وی دیکھتا اچانک چونک جاتا تھا۔

''ایسا قاتلانہ جھوٹ......'' اس کی بڑبڑاہٹ بہ آسانی فاطمہ کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی تھی گو کہ وہ جواب نہیں دیتی تھی اور نہ ہی ظاہر کرتی تھی کہ اس نے ماہر کی بڑبڑاہٹ سن لی ہے تاہم وہ جانتا ضرور تھا کہ اندر ہی اندر وہ سلگتی ہے۔ حمنہ اکثر اپنے ایکسٹرا لاڈوں کی وجہ سے اسے شرمندہ کرواتی تھی۔

ایک دن بڑے جوش میں کہنے لگی۔

''میری ماما سے اچھی کوکنگ کوئی نہیں کرتا...... آپ میرے لیے نوڈلز بنائیے گا۔ چکن نوڈلز......'' حمنہ

اس کے رویے میں روکھا پن پا کر بھی بڑے دعوے سے فرمائشیں کرتی تھیں۔ تب ماہر بھی اخبار دیکھتا متوجہ ہوا۔ پھر چھت کی طرف دیکھ کر بڑبڑاتا ہوا اٹھا تھا۔

''اللہ میرے بچوں کے معدوں پر رحم کرے۔'' کچن کی طرف جاتی فاطمہ لمحے بھر کے لیے رک گئی تھی پھر اس نے تیکھے ابرو اٹھا کر کہا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی...... میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھا کر لوگ اب میزیں کیوں نہیں الٹتے...... ایک بات پہ سارا کریڈٹ حمنہ کی ماں کو ضرور جاتا ہے...... اس نے ناک میں نکیل ڈال کر پالنے کے بگڑوں کو سدھار دیا...... یہ کمال حورعین کے ہی پاس تھا۔'' اس کا انداز بھرپور سراہتا ہوا تھا...... ماہر باہر جاتا، جاتا رک گیا۔

''چلو، تم نے کسی بات پر حورعین کو کریڈٹ تو دیا۔''

''حورعین تو آسکر کی حقدار تھی...... دوسروں کے گھروں پہ شب خون مارنا عام بندے کا کام نہیں ہوتا۔'' اس کے طنز کی کاٹ کو جانے کیسے وہ ضبط سے پی گیا تھا۔ شاید حمنہ کا احساس کر کے...... ورنہ فاطمہ تو جانتی تھی منہ توڑ جواب دیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا تھا۔

''ذرا اپنے الفاظ میں ترمیم کرلو...... شب خون حورعین نے نہیں مارا بلکہ تم نے ہماری زندگیوں میں کسی ناگہانی بلا کی طرح انٹری دی تھی، مجھے کچھ دُہرانے کی ضرورت نہیں...... تم ایک، ایک حقیقت سے آشنا ہو۔'' اس نے جس بات کی طرف اشارہ دیا تھا وہ فاطمہ اچھی طرح جانتی تھی...... یہ ایک ویک پوائنٹ تھا...... سو وہ چپ کر گئی۔

''میں نے کسی کے ساتھ لو میرج نہیں کی تھی...... نہ میں کورٹ میرج کے ذریعے آئی...... مجھے مامی اور ماموں شادی کر کے لائے تھے۔'' فاطمہ نے بڑے... دوٹوک انداز میں جتایا تھا۔

''اور ابھی تک میں اسی گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اللہ کرے کسی کا بھی کسی بے عقل عورت سے واسطہ کبھی نہ پڑے۔'' ماہر کا انداز ہلکا پھلکا ہی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بات بڑھ کر اور رخ اختیار کر لے۔

تعلقات ویسے بھی خاصے کشیدہ تھے۔ مزید کشیدگی کی گنجائش نہیں تھی۔

''آہ...... عقل مند عورت تو ملی تھی...... بس نصیب ہی خراب تھے۔ حورعین ہوتی تو میں یہاں نہ ہوتی۔'' اس نے بڑی تلخ اور کاٹ دار بات کی تھی۔ ماہر لمحے بھر کے لیے چپ ہوا جیسے کچھ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''حورعین ہوتی بھی تو تم یہیں ہوتیں، حورعین کا مرجانا کوئی بہانہ نہیں بنا تھا۔ اس کی زندگی میں ہی اگر مجھے کچھ حقیقتوں کا پتا چل جاتا تو تب بھی تم یہیں ہوتیں۔'' اس نے بڑے مستحکم لہجے میں جواب دیا تھا۔ اب چپ ہونے کی باری فاطمہ کی تھی۔

''تو گویا دس سال کا کشٹ کاٹنے کے بعد آپ کو احساس ہوا کہ تب کچھ غلط ضرور ہوا تھا؟'' وہ جیسے شدتِ غم و غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

''غلط ہوا نہیں تھا فاطمہ......! تم نے غلط کیا تھا؟ مان جاؤ کہ تم انتہائی احمق ہو...... جو بھی ہوا تمہاری بے خبری میں ہوا...... جس کا بھگتان ہم سب نے بھگتا...... سزا تم نے بھی کاٹی اور میں نے بھی......'' ماہر لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔

''سزا کس نے کاٹی؟ ماہر ارباب نے...... ہرگز نہیں تم نے تو حورعین کے ساتھ اچھا وقت گزارا...... امتحان تو سارے میرے لیے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کی جدائی سہی...... ملک بدر ہوئی...... ایک گھٹن زدہ زندگی تک محدود رہ گئی تھی اگر خالہ نہ ہوتیں تو میں مرجاتی۔'' فاطمہ کے جانے کون، کون سے ٹانکے اُدھڑ گئے تھے۔

''اور مجھے میرے باپ کا آخری منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔''

''اس کا تو نام ہی مت لو......'' ماہر کا انداز ہر خند تھا...... مامی اور ان کا لختِ جگر فاطمہ کے پاپا کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ شاید وہ انگریز تھے یا پھر کوئی اور وجہ......؟

''تو پھر کس کا نام لوں......؟ اس آزمائش کا جو

میرے ہی نصیب میں تھی...... اس امتحان کا جو دس سال پر محیط ہو گیا تھا...... کون میرے دس سالوں کے عذابوں کا حساب دے گا؟ کون میرے ماہ و سال کا حساب دے گا؟ میرے بچوں نے جو میرے بغیر وقت گزارا...... میں نے اپنے بچوں کی جدائی کس طرح برداشت کی کوئی میری تکلیف کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔'' فاطمہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ شاید ماہر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا...... وہ خاموش ہو گیا تھا۔

''لوگ خوش نصیب ہیں جو چاہتے ہیں پا لیتے ہیں۔'' اس کا اشارہ حورعین کی طرف تھا۔ وہ بڑے درد بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جیسے اسے مری ہوئی حورعین پہ بھی رشک آ رہا تھا۔

ماہر اسے دیکھتا رہا...... وہ آج بھی ایسی تھی جلد باز، جذباتی، بات بے بات آنسو بہانے والی... جلدی بدگمان ہونے والی...... ہر تاثر کو ظاہر کر دینے والی۔

''تم حورعین کی بات کر رہی ہو؟'' ماہر نے عجیب انداز میں پوچھا تھا۔

''ظاہر ہے...... حورعین کے بجائے کوئی اور اتنا قابلِ رشک ہو سکتا تھا؟'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

''اچھا...... بھلا وہ کیسے خوش نصیب تھی؟'' ماہر نے اگلا سوال داغا...... فاطمہ بغیر رکے شروع ہو چکی تھی۔

''اس کے پاس اتنی قابلیت تھی، وہ اتنی کامیاب تھی پھر اسے من چاہی محبت ملی......'' اس کا لہجہ حسرت آمیز ہو چکا تھا۔ ماہر اسے تاسف سے دیکھتا رہا۔

''مجھے آج پتا چلا ہے حورعین کو تمہارے حسد کی نظر لگ گئی تھی۔'' اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا...... جس پر وہ چلا اٹھی تھی۔

''میں کیوں اسے نظر لگاتی؟ وہ میری خالہ زاد بہن تھی۔''

''لیکن تم نے ہمیشہ اس سے نفرت کی۔'' ماہر کو جتلانا پڑا تھا۔ فاطمہ چپکی سی رہ گئی۔

''اس نے میرا گھر اجاڑا تھا۔''

''اس نے تمہارا گھر نہیں اجاڑا تھا...... یہ کام تم نے خود کیا......؟'' ماہر اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا...... فاطمہ ہکا بکا رہ گئی۔

''میں نے خود؟'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی...... ''مگر کیسے......؟'' اس کا دل کسی انہونی کے خوف سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ماہر لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گیا جیسے کسی سوچ میں گم ہو... اس کے چہرے پر تفکر کا جال تھا اور ان سارے ماہ و سال کی کہانی درج تھی جس کا وقت اور ایک، ایک لمحہ بھاری تھا۔ اتنا ہی بھاری جس قدر فاطمہ پر بھاری تھا۔

وہ جانے کیا، کیا سوچتا رہا کس، کس انداز میں سوچتا رہا۔

پھر جب بولا تو اس کی آواز پہلے کی طرح روکھی اور کھردری تھی۔

''اپنے باپ پر بھروسا کر کے......'' ماہر کے جواب نے فاطمہ کو سرتا پا فریز کر دیا تھا۔

☆☆☆

''ضد اور ہٹ دھرمی صحیح رائے کو بھی دور کر دیتی ہے۔''

یہ بات بہت پہلے فاطمہ کی ممی نے اس کے لیے کہی تھی اور وہ حیران ہوتی تھی کہ اس میں ضد اور ہٹ دھرمی کہاں ہے؟ اپنے تئیں وہ بڑی فرمانبردار تھی، ممی کی ہر بات مانتی تھی۔ ان کی ہر بات کو سمجھتی تھی...... لیکن ممی نے کہا تھا۔

'' فاطمہ خاموش ضدی اور خاموش ہٹ دھرم ہے۔'' اس بات کا بھلا کیا مفہوم تھا؟ فاطمہ کبھی نہ سمجھ پائی لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس میں کچھ عادتیں اپنے باپ والی ضرور موجود تھیں...... اس کا باپ بھی ہٹ دھرم تھا...... اپنی بات پر ڈٹا رہتا اور منواتا چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جاتی فاطمہ بھی ضدی اور ہٹ دھرم تھی۔ گو کہ وہ اپنے باپ کی طرح شور نہیں مچاتی تھی مگر اندر ہی اندر وہ اپنی سوچی ہوئی رائے پر قائم رہتی...... چاہے وہ رائے

غلط ہوتی یا ٹھیک ہوتی...... وہ اپنے ذہن میں آئی سوچ پر عمل کر گزرتی تھی...... لیکن اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی اس کی پشت پناہی ضرور کرتا تھا۔ ماموں کے گھر دس سال بعد آکر بھی وہ ان نکتوں کو آج تک سوچ نہیں پائی تھی جو ماہر اور اس کے درمیان علیحدگی کا باعث بنے تھے۔

اس کی اپنی سوچ اور خیال حورعین تک ہی محدود تھے...... وہ حورعین جو اس کی زندگی میں بھونچال لائی تھی۔ وہ حورعین جو اس کی زندگی میں تہلکہ مچا گئی تھی۔

لیکن اس کے پیچھے کوئی ایک وجہ بھی ضرور تھی......

یہی ناں کہ ماہر ارباب کو حورعین سے محبت تھی...... اس سے بڑی وجہ علیحدگی کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔

چھٹی کے روز مامی نے ایسے ہی حورعین کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

''بعض لوگ بڑے ہی بدقسمت ہوتے ہیں۔ نہ قابلیت ان کے کام آتی ہے نہ حسن اور نہ ہی محبت......'' مامی کے لہجے میں آج بھی حورعین کے لیے ہمدردی محسوس کی جاسکتی تھی...... آہ، حورعین جا کر بھی ان لوگوں کی زندگیوں میں موجود تھی۔ پھر بھی یہ لوگ سمجھتے تھے حورعین بدقسمت ہے۔

''آپ کے بیٹے نے اس سے عشق فرمایا تھا۔ پھر بھی وہ بدقسمت تھی؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی فاطمہ کے لہجے میں جلن در آئی تھی۔

''حورعین کو تو نظر ہی کھا گئی۔ عشق، محبت کسی کے کام کیا آتے ہیں؟ جب قسمت ہی ساتھ نہ دے۔'' مامی کا لہجہ ہنوز وہی تھا۔

''اسے ماہر مل گیا تھا تب بھی وہ بدنصیب تھی؟'' اس نے کڑھتے ہوئے کہا۔

''ماہر تو تمہیں بھی مل گیا تھا...... ماہر کا مل جانا کیا خوش قسمتی کی علامت ہوتا ہے؟'' مامی کے اگلے الفاظ اسے ہکا بکا کر گئے...... کچھ پل کے لیے فاطمہ کچھ بول نہیں پائی...... ایک دم گم صم ہو گئی تھی۔

''ماہر کو مجھ سے محبت تو نہیں تھی ناں......'' اسے بات کرنے کے لیے ایک پوائنٹ مل ہی گیا تھا۔

''اچھا......'' مامی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا...... ''اگر محبت نہیں تھی تو دس سال بعد تم یہاں نہ ہوتیں۔'' ان کا انداز بھرپور جتلانے والا تھا۔

''میرا یہاں دوبارہ آنا ماہر کی مجبوری نہیں...... اسے بچوں کی خاطر مجھے بلوانا پڑا......'' وہ سبزی کاٹتی بہت آزردہ ہو گئی تھی۔ جانے کیا، کیا باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ عموماً وہ گزری باتیں بھلاتی ہی نہیں تھی۔

''تم جو بھی سمجھ لو......'' مامی نے گہری سانس کھینچی۔

''محبت اسے بس حورعین سے تھی۔'' اس نے جلے دل کا پھپھولا پھوڑ ہی دیا۔

''اس کا جواب ماہر سے لینا۔'' انہوں نے صاف دامن بچا لیا۔

''ماہر بھلا کیا جواب دے گا۔ اس کی نشانی کو سینے سے لگا تو رکھا ہے......'' فاطمہ نے کلس کر کہا۔ اشارہ حمنہ کی طرف تھا کیونکہ حمنہ میں ماہر کی جان بند تھی۔ وہ حمنہ کے معاملے میں ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

''کمال ہے۔'' مامی کو پھر سے طنز سوجھا تھا۔ ''تمہاری بھی دو نشانیوں کو اس نے سینے سے ہی لگا رکھا تھا۔'' ان کا اشارہ اس کے بیٹوں عون اور محمد کی طرف تھا۔

''لیکن میرے ساتھ زیادتی تو کی تھی ناں......'' اسے اپنے خسارے رہ، رہ کر یاد آنے لگے۔ ''مجھے گھر سے نکالا تھا......''

''یہ تمہاری اپنی غلطیوں کا خمیازہ تھا...... ٹھیک ہے تب ماہر غصے میں تھا...... لیکن اس نے تمہیں بعد میں بلوایا بھی تھا۔'' مامی نے جتلاتے ہوئے کہا تھا...... فاطمہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''کب بلوایا تھا...کب؟'' اسے تو پچھلے دس سالوں میں ایک بھی ماہر کی فون کال موصول نہیں ہوئی تھی۔

اور مامی کیسا سفاک جھوٹ بول رہی تھیں۔

''کیا تمہارے ماموں نے ایک ہزار ایک فون

نہیں کیے تھے؟ کیا وہ تمہیں لینے پاکستان نہیں گئے......؟ کیا میں نے فون نہیں کیے......؟ کیا حورعین نے تمہاری منتیں نہیں کی تھیں؟ گو کہ شروع کے چند سالوں میں ماہر کا غصہ نہیں اتر رہا تھا۔ وہ تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن بعد میں ماہر نے تم سے رابطہ کرنے کے لیے ہمیں مجبور کیا...... شاید اس کا غصہ اتر گیا تھا یا پھر بچوں کی وجہ سے...... اور اب بھی تمہیں ماہر ہی نے بلوایا ہے......'' مامی ایک ہی سانس میں اس کی آنکھیں کھولتی چلی گئی تھیں۔

''اور تم تب بھی نہیں آئیں...... تم خود نہیں آئیں...... کیونکہ تم ہٹ دھرم ہو......''

''ماہر لینے آتا تو آجاتی...... میں خود سے کیوں آتی؟ ماہر نے حورعین کی وجہ سے مجھے گھر سے نکالا تھا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نکلتی تو اس کی خواہش پوری ہوتی......'' فاطمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ مامی اسے تاسف سے دیکھتی رہ گئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''تم اپنی غلطی بلکہ گناہ کبھی تسلیم نہیں کرو گی۔'' مامی زیر لب بڑبڑا کر رہ گئیں...... ان کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ فاطمہ بہ آسانی سن سکتی۔ اسے بے انتہا دکھ ہوا تھا۔ آخر اب بھی مامی کی نظر میں فاطمہ ہی بری تھی۔

''میں نے کیا گناہ کیا تھا......؟ بتائیں مجھے...... جو بھی ہوا، میرا اس میں کیا قصور تھا؟'' وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''پتا نہیں...... لیکن ہم سب نے بہت ٹف ٹائم گزارا تھا تب...... ماہر تو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ تمہیں طلاق دینا چاہتا تھا۔ یہ تو ہم سب نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا تھا۔'' مامی شاید اب کریڈٹ لینے کے چکروں میں تھیں...... فاطمہ نے کم از کم یہی سمجھا تھا۔

''پھر تم اپنی غلطی ماننے کے بجائے اکڑ بھی گئیں۔ فلوریڈا جانے کے بجائے پاکستان چلی گئیں۔ امر کو تم نے فورس کیا...... تمہیں پاکستان بھجوائے...... پھر حورعین کی ماں کو ہمارے خلاف کر دیا۔'' مامی بھی تاک، تاک کے حملے کر رہی تھیں۔ اگرچہ ساری باتیں ہی ٹھیک تھیں پھر بھی اسے بہت دکھ ہو رہا تھا۔

''مجھے بھی امر نے ہی کہا تھا...... تم پاکستان ریلیکس ہونے چلی جاؤ......'' فاطمہ کی آواز دبی ہوئی تھی۔

''اس نے تمہیں ریلیکس ہونے کو کہا تھا کیونکہ ان دنوں تم بھی ڈپریسڈ تھیں، تنہا تھیں، ماہر کچھ سن نہیں رہا تھا۔ پھر تمہارے لیے اسے یہی بہتر لگا۔'' مامی نے برہمی سے جتلایا۔

''امر نے ہی مجھے بتایا...... حورعین کی شادی کا...... حورعین کو بھی مجبور کیا...... وہ طلاق لے...... لیکن وہ طلاق کیوں لیتی، اس کے تو ارمان پورے ہو رہے تھے۔ اچھا ہوا مر کھپ گئی۔'' آخری الفاظ انتہائی صدمے کی کیفیت میں اس نے منہ ہی منہ کہے تھے۔ گو کہ حورعین اس کی رقیب تھی پھر اس کی وفات کا سن کر فاطمہ کو دکھ ضرور ہوا تھا لیکن اس وقت وہ جذباتی کیفیت میں تھی۔

''حورعین کو گئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا۔ اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔'' فاطمہ کو اچانک ایک اور شکوہ یاد آیا تھا۔ مامی کو چونکنا ہی پڑا۔ ان کی آنکھوں میں تحیر پھیل گیا تھا۔

''ڈیڑھ سال؟ تمہیں کس نے کہا؟'' مامی کی حیرانی پہ فاطمہ بھی چوکنا ہو گئی۔

''مجھے امر بھائی نے بتایا تھا۔''

''اوہو...... امر نے، اچھا، اچھا......'' مامی جیسے سمجھ گئی تھیں...... ''اور دیکھو...... یہ لڑکا دوبارہ آیا ہی نہیں...... بچی کی خبر گیری نہیں لی۔ بزنس بھی تو اس کا ملکوں، ملکوں پھیلا ہوا ہے...... بیچارے کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا...... یہ تو تمہاری وجہ سے نیو انگلینڈ کی مصروفیات ترک کر کے ائرپورٹ پہنچا تھا۔ پھر اسے ٹکٹ بھی کنفرم کروانا پڑا...... پاکستان کے لیے......

''اسے'' بھجوانا جو تھا......'' مامی بھی غیر رواں لہجے میں بولتی اسے کچھ عجیب سی لگیں۔ ان کی کوئی بات بھی اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔ جانے کسے ارجنٹ پاکستان بھجوانے کے لیے امر کو تردد کرنا پڑا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ پھر امر تو میڈیکل اسکول میں پڑھتا تھا۔ بزنس میں کیسے لگ گیا۔ خیر، بزنس تو اس کے باپ کا تھا۔ اور وہ ان کا اکلوتا بیٹا...... باپ کے بعد بزنس کو اسی نے سنبھالنا تھا...... کیونکہ امر امریکا کے کروڑ پتیوں میں شمار ہوتا تھا۔

''حورعین کو امر نے بھی بہت فورس کیا تھا...... وہ ماہر سے طلاق لے...... مگر وہ ایسی کٹھور تھی کہ میرا گھر اجاڑ ڈالا...... میں دس سال اپنے بچوں سے دور... رہی۔'' اسے پھر سے وہی رونا یاد آ گیا۔

مامی اسے تاسف سے دیکھتی رہی تھیں جیسا کہ فاطمہ کا راگ انہیں کچھ بھا نہیں رہا تھا۔ خاص کر گھر اجاڑنے والی بات......

''اپنا کیا دھرا تمہیں بھول چکا ہے...... خیر یاد بھی نہیں کروانا چاہتی......'' مامی کو بلا کا غصہ آ گیا۔

''آپ بھی ہمیشہ مجھے الزام دیتی ہیں...... میں نے کیا گناہ کر دیا تھا؟'' وہ روہانسی ہو کر چیخ پڑی تھی۔

''تم نے حورعین اور ماہر کے نکاح کی خبر پولیس کو نہیں دی تھی؟'' انہوں نے انتہائی کرختگی سے فاطمہ کو حواس باختہ کر دیا...... یہ خاصا کریہہ سچ تھا۔ فاطمہ کا سر جھک گیا...... وہ قدرے شرمندہ ہوگئی لیکن وہ اپنے عمل میں خود کو حق بجانب سمجھتی تھی کہ اسے تب یہی کرنا چاہیے تھا اور اس نے ٹھیک کیا تھا۔

''تو میں اور کیا کرتی؟ مجھے اپنا گھر بچانا تھا۔'' اس نے پست آواز میں کہا۔

''گھر بچ گیا تھا کیا......؟ بلکہ تمہارا یہ عمل ماہر کو اور بھی تم سے متنفر کر گیا......'' مامی کو بھی بھگو بھگو کر مارنی آتی تھیں...... وہ پہلے بھی فاطمہ کو ہر وقت احساس دلاتی رہتی تھیں کہ وہ ماہر کی من چاہی بیوی نہیں ہے۔

''ماہر شروع سے ہی مجھے پسند نہیں کرتا تھا...... کیونکہ بیچ میں حورعین کھڑی تھی...... خالہ جتنی عظیم تھیں حورعین اتنی ہی پست......'' وہ گھٹی، گھٹی آواز میں بول رہی تھی۔

''اور اس نے بہت دفعہ مجھ سے کہا...... میں اس کی زندگی سے چلی جاؤں۔''

''وہ تمہارے ماموں کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا...... انہوں نے زبردستی تم سے ماہر کی شادی کروائی تھی۔'' مامی کو بھی نہ جانے کیا کچھ نہیں یاد آیا تھا۔

''جانتی ہوں سب......'' فاطمہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا...... ''اسی لیے تو میں آتی نہیں تھی۔ ماہر خوش رہتا اپنی حورعین کے ساتھ...... اب بھی حورعین جاتی نہیں تو ماہر مجھے کبھی نہیں بلواتا...... بچے سنبھالنے مشکل جو ہو رہے تھے۔'' وہ زہر خندی بولتی چلی گئی۔

''تم عقل سے خالی ہو......'' مامی نے ہمیشہ کی طرح بے رحمانہ تبصرہ کیا۔

''آپ جو بھی کہہ لیں اتنا تو تسلیم کریں گی ناں کہ حورعین نے آپ کے بگڑے ہوئے لختِ جگر کو سدھار دیا ہے۔ کہاں وہ چلّانے والا...... میزیں الٹنے والا ماہر ارباب...... اور کہاں ایسی تہذیب کے گھر میں موجودگی کا بھی گمان نہیں ہو......'' وہ سبزی کاٹ چکی تو زیرِ لب بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر جانے لگی...... معاً اس کی نگاہ سٹنگ روم کے ڈور فریم پر پڑی...... وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ سبزیوں کا پورا باؤل اس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا...... وہ آنکھیں پھاڑے سامنے دیکھتی رہی تھی۔ اور فرش پر کٹی ہوئی گاجروں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا...... سدا کا چیختا چلّاتا ماہر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا نہ جانے کب سٹنگ روم کے ڈور فریم میں کھڑا ہوا تھا...... اور جانے کب سے وہ ان کی باتیں سن رہا تھا؟ اور اس نے کیا کچھ نہیں سن لیا ہوگا؟ فاطمہ کا دماغ جیسے گول، گول گھومنے لگا...... مارے شرمندگی کے اس سے سر اٹھانا مشکل ہو گیا۔

☆☆☆

امر کا اس گھر میں قیام اور آمد و رفت لازم و ملزوم تھی۔

فاطمہ پچھلے سالوں پر نگاہ ڈالتی تو اسے ہر موڑ پر امر کی یادیں اس گھر میں بکھری نظر آتیں۔ وہ اپنے گھر میں کم، کم قیام کرتا تھا...... اس کا ہر وقت کا پڑاؤ اسی گھر میں تھا......

لیکن اب امر کو آئے ہوئے مہینہ بھر سے اوپر ہو گیا تھا۔ مامی ہر وقت امر پر غصہ کرتیں۔ ان کی ہر بات کا اختتام اس فقرے پر ہوتا۔

''بچی کی ذرا بھی پروا نہیں...... دونوں مصروف، دونوں آؤٹ آف اسٹیشن۔'' ان کا غصہ ناک کی نوک پر رہتا تھا اور حمنہ بھی پورے دن میں کئی مرتبہ پوچھتی......

''ڈیڈی! وہ لوگ کب آئیں گے؟'' کبھی کبھی جب وہ زیادہ اپ سیٹ ہوتی تو ماہر حمنہ کو لیے کمرے میں چلا جاتا...... جانے کون لوگ تھے جنہیں حمنہ مس کر رہی تھی اور کبھی، کبھی شدت سے کرنے لگتی...... تب ماہر آؤٹنگ کا لازمی پروگرام بنا لیتا تھا۔

ڈزنی لینڈ میں گزرا وہ دن بھی ایسا ہی بیکار سا تھا۔ فاطمہ کو بالکل ہی بیکار لگا...... ایسا دن جس میں ماہر بس حورعین کی بیٹی کے نخرے اٹھاتا رہا تھا۔ گو کہ عون اور محمد بھی بہت خوش تھے اور پورا دن ڈزنی لینڈ میں انجوائے کرتے رہے۔

''ڈیڈی کے ساتھ کبھی، کبھی اتنا انجوائے کرنے کا موقع ملتا ہے۔'' عون بہت خوش تھا...... ڈزنی لینڈ میں آ کر بھی خوش ہوتے ہیں ڈزنی لینڈ ایک جادو نگری ہے۔

فاطمہ نے اپنی پوری زندگی میں ڈزنی لینڈ کو نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ بہت غریب تھا اور ممی بس اتنا کماتی تھیں جس سے پیٹ کا سلسلہ چل سکتا۔ باقی عیاشیاں تو بس خواب اور خیال تھیں۔

ان کے مقابلے میں ممی کے رشتے دار بہت امیر تھے۔ ماموں کا اپنا بزنس اور گھر تھا۔ اور پاکستان والی خالہ بھی بہت امیر تھیں۔ بس انہی کے حالات بہت خراب تھے۔

آئندہ افطاری کے چند رہنما اصول یاد رکھیں

1۔ دستر خوان پر اس جگہ بیٹھیں جہاں آپ کا ہاتھ ہر چیز تک جا سکے۔

2۔ شربت کا جگ اپنے سامنے مگر تھوڑا سا دور رکھیں ورنہ سب آپ سے شربت مانگتے رہیں گے۔

3۔ دوسروں پر نظر رکھیں اور چیزوں پر بھی دیکھیں کون سی چیز جلد ختم ہو رہی ہے۔

4۔ ہر پانچ منٹ بعد تھوڑا سا شربت پی لیں تاکہ ٹھونسی ہوئی چیزیں نیچے ہو جائیں اور نعمتوں کی جگہ بن جائے۔

5۔ کھجور کی گٹھلیاں اپنے ساتھ والے کی پلیٹ میں ڈالتے جائیں تاکہ آپ کا دامن صاف رہے۔

نوٹ:

دستر خوان سے اٹھنے سے پہلے مکمل اطمینان کر لیں کہ کوئی چیز بچ تو نہیں گئی۔

خصوصی نوٹ...... اس سال ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ آئندہ بھی ہوں۔

از: مہ وش، سمرن راجپوت، سیالکوٹ

اظہارِ ہمدردی

ایک خاتون اپنی پڑوسن سے کہہ رہی تھیں۔

''اتنی دیر ہو گئی، منے کے ابا واپس نہیں آئے، ہو سکتا ہے کہ آج وہ پھر شراب خانے چلے گئے ہوں۔''

''اے ہے......! تم ہر بات کا برا پہلو ہی کیوں سوچتی ہو؟'' پڑوسن نے کہا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بس کے نیچے آ گئے ہوں۔''

شاعرہ: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

اور اس وقت فاطمہ اپنی سابقہ زندگی کو سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ زندگی جو کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر تھی، وہ بڑے عرصے بعد فلوریڈا آئی تھی۔ قریب چودہ سال بعد...... یہ فلوریڈا تھا...... اس کا آبائی شہر...... جائے پیدائش...... لیکن فلوریڈا میں ابتدائی سولہ سال گزار کر بھی اس نے کبھی ڈزنی لینڈ کی سیر نہیں کی تھی۔ اسے ڈزنی لینڈ کو دیکھنے کی بہت حسرت تھی۔ بہت شوق تھا ایسا ہی شوق جیسے پاکستان میں کسی بچے کو سفاری پارک دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ مگر فاطمہ کو تو جنونی شوق تھا۔ کیونکہ ڈزنی لینڈ ایک جادونگری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایسی جادونگری جس میں انسان کھو جائے، گم ہو جائے اور کبھی خود سے بھی نہ مل سکے۔ ڈزنی ورلڈ کو چھ حصوں میں اچھی طرح منظم بنایا گیا تھا۔ اس کا ماسٹر مائنڈ والٹ ڈزنی تھا...... جس کی ذہانت نے یہ منفرد اور اچھوتا جادو گھر بنایا تھا۔

کوئی بھی انسان اس کو دیکھ کر خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتا...... جہاں جا کر تمام غم دنیا سے نجات مل جاتی...... وہ مین اسٹریٹ امریکا پر چلتی ہوئی بہت دور جا رہی تھی۔

بچے پرانے فیشن کی اسٹیم انجن والی ریل گاڑی میں بیٹھ چکے تھے جو پوری جادونگری کے اردگرد چکراتی تھی۔ اس کے قریب سے ہاؤس بگھی گزر رہی تھی۔ بگھی کے آگے دو گھوڑے بندھے تھے۔ گھوڑے بہت خوب صورت تھے۔ جن کے بڑے، بڑے پاؤں ہوتے ہیں۔

مین اسٹریٹ کے آخری کارنر پر خوب صورت سنڈریلا کاسل جنہیں پریوں کا محل کہتے تھے۔ اس کی اٹھارہ منزلیں تھیں۔

اور بہت بچپن میں وہ سنڈریلا کاسل دیکھنے کی خواہش میں ممی کا سر کھاتی تھی۔ اس پر ضد اور ہٹ دھرمی سوار ہو جاتی۔ وہ روتی، چیختی اور پھر کونے میں گھس کر لاتعلق ہو جاتی...... منظر سے غائب ہو جاتی۔ اس کی۔ بچپن سے یہی عادت تھی۔ وہ مقابل کی مجبوری کا سبب نہیں کھوجتی تھی۔ بس بدگمان ہو کر غائب ہو جاتی۔ منظر سے دور ہو جاتی اور تب تک اسی طرح رہتی جب تک اپنا دل واپسی کو نہ چاہتا۔

فاطمہ کو اچھی طرح یاد تھا۔ جب اس کی ماہر سے شادی ہوئی...... تب اس نے پہلی فرمائش میں ماہر سے کہا۔

''مجھے ڈزنی لینڈ دیکھنا ہے، مجھے سنڈریلا کاسل جانا ہے۔'' یہ فاطمہ کی بچپن سے دل میں دبی معصوم خواہش تھی اور اسے لگا یہ خواہش پوری کرنا ماہر کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ اس کے پاس وسائل بھی تھے۔ پیسہ بھی تھا اور وقت بھی...... لیکن ماہر اس کی فرمائش پر حیرت سے چیخ اٹھا تھا۔

''تم نے فلوریڈا میں رہ کر ڈزنی لینڈ نہیں دیکھا؟''

اس کی چیخ ایسی بھیانک نہیں تھی جس قدر اس کا رویہ ہتک آمیز تھا۔ ایک تو ماہر نے اس شادی کو قبول ہی نہیں کیا تھا...... وہ تو فاطمہ کو دیکھتا تک نہیں تھا۔ اوپر سے ایسی بے تکلفانہ فرمائش...... جیسے وہ دونوں بڑی محبت کرنے والے میاں بیوی ہوں۔ وہ تو اس کی دیدہ دلیری پر حیران تھا۔ پھر اپنی مغرور ماں کے ساتھ مل کر اس کا مذاق اڑاتا رہا...... مامی بھی موقع کی تلاش میں تھیں۔ انہیں بھی فاطمہ پر طنز کے تیر برسانے کا موقع مل گیا تھا۔

''اس کا باپ اسے ٹافی تک لا کر نہیں دیتا تھا کجا کہ سیریں کراتا...... ملائکہ کو اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔''
مامی کو اس کی ممی پر بھی کیچڑ اچھالنے کا موقع مل گیا تھا۔

تب اس کا دل مامی سے کھٹا ہوا ہی تھا۔ ماہر سے بھی کھٹا ہو گیا تھا کیونکہ وہ بھی اس کی ممی پر الزام لگانے لگا۔

''یہ سب ملائکہ پھپھو کے اعمال کی سزا ہے۔ انسان کو اتنا بھی اپنے مقام سے گر نہیں جانا چاہیے کہ اسے اچھے، برے کی پہچان ہی نہیں رہے۔'' ماہر کی اس

بات پر فاطمہ خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ وہ غصے میں پھٹ پڑی تھی۔ اور اس نے ماہر کو بے نقط سنا ڈالی تھیں۔ اس بات کو قطعاً نظر انداز کر کے کہ وہ چار دن کی نو بیاہتا دلہن ہے۔ اس کی بکواس سن کر ماہر چیخ اٹھا تھا۔

''یہ ترس کے قابل نہیں تھی...... دیکھا آپ نے...... اس کی لمبی زبان کو...... میں تو کبھی اس سے شادی نہیں کرتا آپ نے میرے ساتھ بہت برا کیا ممی...... کتنی اجڈ اور جاہل ہے۔ اس میں بالکل تمیز نہیں......'' ماہر کا یہ غصہ پھر کم نہیں ہوا...... بلکہ وقت کے ساتھ، ساتھ بڑھتا رہا۔ اس دن کے بعد سے ماہر کو فاطمہ میں بس کیڑے ہی کیڑے دکھائی دینے لگے۔

وہ اس کی نظر میں جاہل تھی، ان پڑھ تھی، اجڈ تھی، کم عقل تھی۔

اس نے فلوریڈا میں پیدا ہو کر بھی گنوا دیا تھا...... اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ بات میں سلیقہ، نہ وقار، نہ ٹھہراؤ...... اسے تو بس ممی نے چوزوں کے دڑبے میں قید کر رکھا تھا تا کہ اسے امریکی معاشرے کی ہوا نہ لگے۔ اسی خوف کے زیر اثر وہ فاطمہ کے بنیادی حقوق، تعلیم اور اعتماد کو نظر انداز کرتی رہی تھیں۔

مین اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے فلوریڈا کی یادوں نے اچانک اس پر حملہ کر دیا تھا پھر اسے وہ زندگی یاد آنے لگی جو اس نے ماہر کے ساتھ گزاری تھی۔

عون اور محمد کے بعد بھی وہ فیری لینڈ میں پرانی اسٹیم ٹرین جیسی زندگی گزارتی رہی تھی۔ جس میں بیٹھ کر انتہائی خوفناک سین دکھائی دیتے تھے۔

بظاہر اس کی زندگی ڈزنی لینڈ سے کم نہیں تھی۔ لیکن اس کے اندر آ کر پتا چلتا کہ وہ کتنا خوفناک وقت گزار رہی تھی۔

بچے ابھی تک قلعہ جات، ریچھ، جمبو دی ڈائمنڈ، ہارس شو اور شوٹنگ کرنے کا شوق پورا کر رہے تھے۔ ماہر اسے مین اسٹریٹ پر اندھا دھند چلتے دیکھ کر لبرٹی اسکوائر کی طرف لے آیا تھا۔ وہ جو.... اپنے دھیان میں مگن اور گم تھی۔ ماہر کے بازو کھینچنے پر بھی چونکی نہیں تھی

ماں کے نام

اپنی پلکوں پہ میرے اشک پرونے والی
مجھ سے بھی پہلے میرے درد پہ رونے والی
میری ہر سانس ہے مقروض محبت تیری
بوڑھے ہاتھوں سے میرے کپڑوں کو دھونے والی
مجھ کو احساسِ یتیمی سے بچائے رکھا
پھول ہی پھول میری راہوں میں بونے والی
مجھ کو جرموں کی تلافی کا بھی موقع نہ دیا
بے خیالی میں میرے ہاتھ سے کھونے والی
صبر اور شکر تیری عمر کا حاصل ٹھہرے
قلزمِ فقر میں تن من کو ڈبونے والی
روز روتی ہے میری تلخ مزاجی تجھ کو
میٹھی باتوں سے میرے دل کو بھگونے والی
کون راتوں کو میرے واسطے اب جاگے گا
تختِ فردوس پہ آرام سے سونے والی
ماں کو کھویا ہے تو یہ راز کھلا ہے دائم
ماں تو ماں ہوتی ہے چاہے ہو کھلونے والی

شاعر: دائم بٹ

مرسلہ: یاسمین کنول، پسرور

نظم

کبھی مہندی سے سجا لو تم اپنے ہاتھوں کو
اس سجاوٹ کے کسی کونے میں
ہمارا بھی نام لکھ دو
یہ نام صرف ہم دونوں کو ہی نظر آئے
کچھ اس طرح سے ہم دونوں کا نام لکھ دو
تیری مہندی سے سجے ہاتھوں کو
میں اپنے ہاتھوں میں لوں گا
تیری مہندی کی خوشبو کو
اپنے دل میں قید کر لوں گا
ڈھونڈ لوں گا میں تیرے ہاتھوں میں
چھپے ہم دونوں کے نام

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

بلکہ اس کے ساتھ ہی گھسٹتی چلی آئی۔
پھر ایک راؤنڈ ٹیبل کے راؤنڈ اسٹول کو کھینچ کر ماہر نے اسے بیٹھنے کا کہا۔ اور پھر خود کو لمبیا ہار بر ہاؤس سے سمندری خوراک یعنی مچھلیوں کی ڈشز اٹھالایا۔
پھر اس نے بچوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ بھوک سے ابھی کوسوں دور تھے۔ سو وہ گم صم سی فاطمہ کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔
''تمہاری برسوں کی خواہش پوری ہوگئی......؟'' اس کا انداز طنزیہ نہیں تھا۔ پھر بھی فاطمہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ شاید ماہر کی بات کو سمجھنا چاہتی تھی۔
''برسوں کی خواہش؟'' اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔
''ہاں......ناں......ڈزنی لینڈ کو دیکھنے کی خواہش......'' ماہر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی تھی۔ فاطمہ جان نہیں پائی تھی کیا یہ مسکراہٹ طنزیہ تھی؟
اور اس نے کتنی پرانی بات کا حوالہ دیا تھا۔ قریب چودہ سال پہلے فاطمہ کی وہ خواہش جو ماہر کے مذاق میں دب کر دم توڑ گئی تھی۔
''تم سنڈریلا کاسل نہیں دیکھوگی؟'' اس نے شرارتاً ہونٹ کا کونا دبا کر کہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو فاطمہ پھٹ پڑتی مگر اس وقت وہ فضول بحث میں اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''نہیں......'' اس نے منہ پھاڑ کر جواب دیا۔ ماہر ہنوز مسکراتا رہا...... جیسے اس کے نہیں کو انجوائے کر رہا ہو۔
''اگر کسی نے پوچھا تو بتا دینا......سنڈریلا کاسل میں بہترین ریستوران، اسنیک بار، کیفے، بیکریز، خوب صورت اسٹال، ہاؤس آف میجک جیولرز، بینک، فرسٹ ایڈ سینٹر موجود ہیں۔'' وہ کسی ٹورسٹ گائڈ کی طرح اسے بتا رہا تھا۔ فاطمہ کو بلا کا غصہ آیا مگر وہ پی گئی۔ اس وقت وہ کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''ویسے تم ڈزنی لینڈ میں ہنی مون منانا چاہتی تھیں ناں......؟ لیکن یہ جگہ تو بچوں کی انجوائے منٹ کے لیے ہے......تم ہنی مون کے لیے بش گارڈن کا انتخاب کرتیں۔ ویسے وقت اب بھی نہیں گزرا......اگر تم چاہو تو ہنی مون کا ایک سویٹ تیار ہوسکتا ہے۔'' ماہر جان بوجھ کر اسے تپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ وہ غصے میں کچھ تو بول اٹھے۔ لیکن فاطمہ فی الوقت ضبط سے کام لے رہی تھی۔
''تم کیا سوچ رہی ہو فاطمہ؟'' ماہر کو ذرا سنجیدہ ہونا ہی پڑا تھا۔ فاطمہ نے بھی ناپ تول کر اس کی ساری طراری نکالنے کا سوچا...... اس نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔
''میں حورعین کو سوچ رہی ہوں۔''
''تم کبھی اپنے بارے میں بھی سوچ لیا کرو......کبھی اپنی غلطیوں پر بھی نظرِ ثانی کرلیا کرو......'' اس کی توقع کے عین مطابق ماہر چڑ گیا تھا۔ شاید وہ اس وقت حورعین کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیسا بے وفا تھا، ماہر...... اتنی جلدی حورعین کو بھول بھی گیا۔ مرد ایسے ہی ہرجائی ہوتے ہیں۔ اس کے پاپا بھی ممی کو جلدی بھول گئے تھے۔ وہ ممی جنہوں نے پاپا کی خاطر ہر قسم کی صعوبتیں اٹھائی تھیں، مشکلات جھیلی تھیں۔
''ہر کوئی مجھے میری غلطیوں کا احساس دلاتا ہے۔ میں نے کون سا گناہ کر دیا تھا؟'' فاطمہ چیخ پڑی تھی۔ ماہر لمحے بھر کے لیے چپ کر گیا۔ اس کی آنکھیں لال ہوگئی تھیں اس کا چہرہ بھی سرخ ہوگیا تھا۔ وہ غیظ و غضب سے بھر گیا تھا۔ پھر وہ بڑے ہی ضبط کے ساتھ بولا۔
''تم اپنی یادداشت کھو چکی ہو...... یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں خود بھی اس شرمناک قصے کو دہرانا نہیں چاہتا...... بہتر ہے ہم کوئی اور بات کرلیں۔'' ماہر کا دوٹوک انداز اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گیا تھا۔ فاطمہ کا سر جھک گیا...... اس کی یادداشت سلامت تھی...... اور اسے وہ شرمناک قصہ بھی یاد تھا...... مگر اس سب میں اس کا قصور کہاں نکلتا تھا۔

(جاری ہے)

سے دودھ ختم کرواور اپنی دادی کی دوائیں لے کر آؤ میڈیکل اسٹور سے...... رات سے ختم ہیں۔'' امی نے آدھا باقی رہ جانے والا دودھ کا مگ دوبارہ پورا بھر کے زیاد کے سامنے دھرا اور خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر ٹیبل پر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ گھر کے تمام افراد اسی چھوٹے سے کچن ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کرتے تھے۔

''مجھے نہیں پینا دودھ، امی! خدا کا واسطہ ہے، اب آپ کی اولاد بڑی ہوگئی ہے۔ ناشتے میں تھوڑی سی ترمیم کردیں۔ چائے بنا کردیں مجھے......''

''زیاد بیٹا ہر بات کو انا کا مسئلہ مت بنالیا کرو۔ گھر میں اس طرح فساد پیدا ہوتا ہے، چلو شاباش ختم کرواب اسے۔'' امی نے رسان سے ایک بار پھر سمجھایا تھا۔ وہ اس کے غصے کو قابو کرنا جانتی تھیں۔

''امی! پروفیسر صاحب سے کہیں اپنے حکم میں تھوڑی تبدیلی لائیں۔ دودھ ناشتے کے بجائے رات سونے سے پہلے دے دیا کریں۔ کسی کو پتا چلتا ہے تو ہنستا ہے ہم پر کہ کالج، یونیورسٹی میں آکر بھی ہم ناشتے میں بچوں کی طرح دودھ لازمی پیتے ہیں۔'' زیاد سخت اپ سیٹ تھا اور امی اس کا سبب بھی جانتی تھیں۔ دودھ تو محض غصہ نکالنے کا بہانہ تھا۔ امی نے صبر کا گھونٹ بھرا اور تحمل سے گویا ہوئیں۔

''سب سے پہلی بات کہ میں نہیں سمجھتی کہ دودھ صرف بچوں کے پینے کی چیز ہے۔ تمہارے ابو کیا بچے ہیں؟ میں نے ساری عمر پروفیسر صاحب کو ناشتے میں دودھ پیتے دیکھا ہے۔'' امی نے لفظ پروفیسر صاحب پر زور دے کر کہا۔ ''اور دوسری بات...... پروفیسر صاحب تمہارے باپ ہیں اور باپ کو اس کے پیشے کے حساب سے نہیں، رشتے کے حساب سے بلایا جاتا ہے۔ سمجھے......'' امی نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی تھی۔ جبکہ زیاد کے چہرے کے تاثرات میں بیزاری مزید نمایاں ہوگئی۔

''زیاد......'' امی کو اس کے تاثرات سے دکھ پہنچا تھا۔

''ہوں......'' وہ مگ کے کنارے پر انگلی پھیرتا کسی سوچ میں گم تھا۔

''بیٹا! ماں، باپ اولاد کا کبھی دانستہ برا نہیں کرتے...... نہ سوچتے ہیں...... ہاں یہ بات انہیں سمجھا نہیں سکتے۔ شعور کی طنابیں، وقت کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں، جو خود بخود عمر کے کسی حصے میں ان کے دماغ میں اتر جاتا ہے۔ تم سے صرف یہی کہوں گی کہ باپ کے لیے بدگمان ہونے کے بجائے انہیں سمجھو...... جس طرح بائیس سال انہوں نے تمہیں سمجھا ہے۔'' زیاد نے ایک نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا اور کرسی پیچھے کر کے کھڑا ہوگیا۔ کچن سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک نظر وہاں سے نظر آنے والے ''پروفیسر صاحب'' کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور صحن کے رخ کھلنے والے کچن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ امی نے دکھ اور تاسف سے دودھ سے بھرے مگ کو دیکھا جو جوں کا توں پڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''ٹھک، ٹھک، ٹھک......'' آدھا گھنٹا ہوگیا تھا زیاد کو اپنی بائیک کے ساتھ ''ٹھک، ٹھک'' اور خود سے ''بک بک'' کرتے ہوئے۔ قریب ہی کرسی پر براجمان دادی تسبیح کے دانے گراتی بغور پوتے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کی پنڈلیوں کا تیل سے مساج کرتی گھریلو ملازمہ زیاد کی چڑ چڑاہٹ کا لطف اٹھاتی وقفے، وقفے سے کھی کھی کرنے میں مصروف تھی۔ زیادہ کی برداشت جواب دے گئی۔

''اپنی کھی، کھی کنٹرول میں رکھ ثوبیہ......! نہیں تو تمہارے سر میں بھی دو پیچ ٹھونک دوں گا سمجھی......؟'' زیادہ نے اوزار کے ساتھ ملازمہ کو گھورا۔

''اونہوں! زیاد لحاظ رکھو...... اور ثوبیہ تم بھی

اٹھو اب...... دیکھو جا کر تمہاری آپا کو کسی کام میں تمہاری ضرورت نہ ہو۔'' دادی اماں نے ملازمہ کو بہو کے پاس اندر روانہ کیا انہیں گھر کے مردوں کا ملازماؤں کے منہ لگنا قطعاً پسند نہیں تھا۔

''اور زیاد! تمہیں کاہے کا اتنا غصہ ہے جو اپنی بائیک کو آدھے گھنٹے سے مارے جارہے ہو۔ بس مارے جارہے ہو۔'' دادی اماں کا اشارہ زیادہ کی بائیک کی طرف تھا جس پر اپنا نہ جانے کون سا غصہ وہ نکال رہا تھا۔

''یہ اسی قابل ہے کہ اسے روز مارا جائے، سائیکل سے بدتر ہوچکی ہے، روز کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوا رہتا ہے اس کے ساتھ۔'' وہ سخت اکتایا ہوا تھا۔

''مسئلہ تمہارے دماغ کے ساتھ ہے، جو تمہیں یہ اچھی بھلی بائیک، سائیکل سے بدتر دکھ رہی ہے۔ ابھی ہفتہ پہلے تمہارا باپ تفصیلاً مکینک کو دکھا کر لایا ہے اور مکینک کے بقول تمہاری بائیک بالکل فٹ ہے۔ ہاں...... اگر تم یونہی اوزار لے کر اس کو ٹھوکتے رہے تو یقیناً ان فٹ ہوجائے گی۔ جیسا کہ تم چاہتے ہو۔'' دادی اماں نے چشمے کے اوپر سے دیکھتے ہوئے اسے بہت کچھ جتایا تھا۔ ان کی گفتگو ہمیشہ بڑی مدلل ہوتی تھی۔ اپنے وقت کی آٹھ جماعتیں پڑھ رکھی تھیں، پروفیسر کی ماں تھیں اور بزرگوں کی باتوں میں علم کے سمندر سے زیادہ تجربہ ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ زیاد ہمیشہ کی طرح جز بز ہوکر رہ گیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اوزار فرش پر رکھتا دادی اماں کے پاس چلا آیا۔ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ دھر کر خود بھی وہیں ٹک گیا۔

''دادی اماں! پلیز آپ میری سفارش کردیں ناں...... دیکھیں آپ کے سامنے ہی تو ہے میری بائیک کی حالت......'' دادی اماں نے خشمگیں نظروں سے گھورا تھا۔

''اچھا، اچھا...... اچھی بھلی ہے میری بائیک......'' زیاد نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ہتھیار ڈالے تھے۔

''بس میرا شوق ہے ہیوی بائیک...... میرے دو دوستوں کے والد نے انہیں لے کر دی ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ حسن کے والد تو آسانی سے افورڈ بھی نہیں کرسکتے پھر بھی محض بیٹے کے شوق کی خاطر انہوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا اور ایک پروفیسر......'' زیاد نے زبان فوراً دانتوں تلے دبائی تھی۔ دادی اماں کے سامنے وہ باپ کو پروفیسر صاحب کہتا تو انہوں نے ایک زور کا دھر دینا تھا۔ ایسی زبان وہ صرف ماں کے سامنے ہی استعمال کرتا تھا۔

''میرا مطلب ہے آپ ابو سے کہیں ناں کہ مجھے بھی ہیوی بائیک لے دیں۔ وہ تو افورڈ بھی کرسکتے ہیں...... پلیز......! آپ کہیں ناں ان سے...... پتا نہیں ابو اپنے بچوں کی خواہشات کو ترجیح کیوں نہیں دیتے......؟ اوروں کے باپ بھی تو ہیں، اولاد کے منہ سے نکالنے سے پہلے چیز سامنے لا دھرتے ہیں لیکن ہمیں محض میانہ روی کا چورن چٹا دیتے ہیں۔ آخر ہماری بھی آرزوئیں ہیں، امنگیں ہیں۔'' اپنے تئیں زیاد نے دادی اماں کو جذباتی حوالے سے گھیرنے کی کوشش کی تھی مگر دادی اماں کے انداز و اطوار میں تبدیلی نظر نہیں آرہی تھی۔ چند لمحے پوتے کا چہرہ بغور جانچنے کے بعد وہ گویا ہوئیں۔

''زیاد میرے بچے......! تمہارے پیدا ہونے سے لے کر تمہارے جوان ہونے تک کوئی ایسا لمحہ مجھے یاد نہیں جب تمہارے باپ نے تمہاری بنیادی ضروریات سے نظر چرائی ہو۔ تمہاری بھوک میں تمہیں خوراک مہیا کی، تمہاری بیماری میں تمہارا علاج کرایا، تمہیں بہترین اوڑھایا، پہنایا...... نرم گرم بستر پر سلایا، سردی گرمی سے بچایا، جس کالج اور یونیورسٹی کا نام تم نے لیا، وہیں تمہیں پڑھایا، تمہاری ہی خواہش پر صرف ڈیڑھ سال پہلے تمہیں نئی بائیک لے کردی تھی حالانکہ گھر میں گاڑی کی سہولت پہلے سے ہی موجود تھی۔'' زیاد کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمایاں تھی مگر دادی اماں نے بات

جاری رکھی تھی۔ ”اور میرا خیال ہے کہ صرف چھ ماہ ہی ہوئے ہیں ناں تمہیں لیپ ٹاپ لے کر دیے ہوئے۔ تمہاری تین بہنوں کی تعلیم و تربیت اور پھر مناسب جہیز کے ساتھ بیاہ، میرا خیال ہے تمہارے باپ نے ہی کیے ہیں۔ پروفیسر درویش منش ضرور ہے مگر دنیا داری نبھانا جانتا ہے۔ اب اگر تمہاری ہیوی بائک کو فضول خرچ مان کر وہ دلانے سے انکار کر رہا ہے تو اس میں ایسا غلط بھی کچھ نہیں...... نہیں ہوں گے اس کے پاس اس قدر پیسے...... اپنے باپ کو سمجھو زیاد...... اسے آزماؤ مت......“ آخر میں دادی کا لہجہ بلاشبہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

”یہی تو...... یہی تو دادی اماں...... آخر کہاں جاتے ہیں پیسے......؟ میں نہیں مانتا کہ ابو کے پاس پیسے نہیں...... وہ میتھس، اسٹیٹس کے جانے مانے استاد ہیں، اکیڈمی بھی رن کر رہے ہیں پھر بھی آپ کہتی ہیں، پیسے نہیں...... چھوڑیں بھئی......“ زیاد نے تنفر سے سر جھٹکا اور دادی اماں کے دل کو جھٹکا لگا تھا۔ ان کے پاس جواب میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ بت بنی زیاد کو پلٹ کر واپس جاتے اور بائیک کے پاس پڑے اوزار سمیٹتے دیکھتی رہی۔

اولاد ماں، باپ سے حساب کیوں مانگتی ہے؟ اور ماں باپ اسے صفائیاں کیوں دیتے ہیں؟ ساری عمر معاشی تنگ و دو کی چکی کے پاٹوں میں پسنے کے بعد بھی اولاد کی تشنہ اور ان کہی خواہشات سالم پہاڑ کے مانند کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ ساری عمر جس اولاد کے لیے والدین اپنی ہستی مٹاتے رہتے ہیں، اولاد کی بن کہے جان جانے والے ماں، باپ جب بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے ان سے یہ گمان کرتے ہیں کہ آج بچے بن کہے والدین کے دل میں اتر جائیں، بن کہے جان جائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو اولاد ”بوڑھا، بچہ ایک برابر......“ کا ٹیگ لگا کر ماں باپ کو احتیاط سے ایک ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ جن ماں، باپ نے ہمیں بچے سے بڑا کیا وہ آج انہی کے لیے بچہ کیسے بن سکتے ہیں؟

☆☆☆

زیاد، پروفیسر محمود کا اکلوتا بیٹا اور تین بہنوں کا اکلوتا چھوٹا بھائی...... زیاد کے خیال میں وہ لاڈلا، اکلوتا، کبھی نہیں رہا۔ اور اس کی وجہ زیاد کے خیال میں خود اس کے والدِ محترم تھے۔ پروفیسر محمود اصول پرست اور سادہ طرزِ زندگی کے عادی ایک ایسی شخصیت، جن کے مداحوں میں ان کے اسٹوڈنٹس کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ اہلِ محلّہ بھی شامل تھے۔ معلم کے طور پر قابلِ تحسین زندگی گزاری تھی۔ حلال کھایا تھا اور حلال کمایا تھا۔ بقول بیٹے کے بہت زیادہ کمایا تھا مگر کہاں ٹھکانے لگایا تھا یہ اس کی نظر میں باپ کی زندگی کا سربستہ راز تھا۔ اس کی اپنی نظر میں وہ خاصی مظلوم زندگی گزار رہا تھا جس میں اس کی ڈھیروں آرزوؤں کا خون ہو رہا تھا۔ بہت سی خواہشات مارنا پڑ رہی تھیں۔ زندگی کی ہر سانس پروفیسر صاحب کے حکم کے تابع تھی۔

”دودھ زندگی کا لازمی جزو، نہار منہ بادام ضرور کھانے ہیں، سونے سے پہلے چائے، کافی نہیں پینی؟ سردیوں میں ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ دودھ جلیبی لازمی کھانی ہے، رات نو بجے کے بعد گھر سے باہر رہنا ممنوع ہے، گھر میں چاہے ستر دوست بلوا لو مگر ہوٹلوں، کلبوں میں دوستوں کے ساتھ غل غپاڑا کرنا حرام، کمرے کا دروازہ بلاوجہ لاک نہیں کرنا اور باتھ روم میں نہانے میں پندرہ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہونے چاہئیں۔“ ان تمام احکامات کو مانتے زیاد، بچے سے جوان ہوا تھا پر اب وہ آزادی چاہتا تھا۔ وہ ناشتے میں دودھ کے بجائے ڈھیر ساری کافی حلق سے اتارنے کا خواہش مند تھا۔ باداموں سے آسے چڑ ہو گئی تھی۔ وہ کھلی پاکٹ منی کا خواہش مند تھا۔ زندگی ایک ڈھب پر گزارتے، عاجز آچکا تھا۔ وہ پروفیسر صاحب کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اب بچہ نہیں رہا بلکہ ایم بی اے کے فائنل سمسٹر میں آچکا ہے۔ اس کا حلقۂ احباب ہے...... وہ شہر کی ایک بہترین یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے (جو بقول اس کے پروفیسر صاحب نے محض دھاک بٹھانے کے لیے اس کا شہر کی بہترین یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا کر، اتنا خرچا کیا ہے) اب اگر وہ ایسی اونچی جگہ پر پڑھے گا تو رکھ رکھاؤ تو رکھنا پڑے گا ناں......

اور اس نے کوئی ایسی ہیوی ڈیمانڈ تو نہیں کی محض ”ہیوی بائیک“ ہی تو مانگی ہے مگر پروفیسر صاحب کا میانہ روی کا اصول ان کے آڑے آرہا تھا جبکہ زیاد کے خیال میں اصل رکاوٹ ”بخل“ ہے، پروفیسر صاحب اپنی اولاد کے معاملے میں کنجوس ہیں، ٹھیک ہے اگر کچھ عرصہ پہلے ہی انہوں نے نئی بائیک دلائی تھی تو کیا ہوا......؟ کیا باپ ایک کے بعد دوسری چیز نہیں دلاتے......؟ اس کا اصل رونا ہی یہی تھا کہ پروفیسر صاحب پیسے کا کیا کرتے ہیں؟ ان کے ”سوشل اسٹیٹس“ سے وہ بخوبی واقف تھا۔ پھوں پھاں کی عادت نہ ان میں تھی نہ امی میں...... گھر بھی سادگی اور سلیقہ مندی کا منہ بولتا ثبوت تھا تو پھر اس کا ”حق......“ پروفیسر صاحب کسے دیتے رہے ہیں جو اس کے لیے ان کے پاس محض ایک ہیوی بائیک کے لیے رقم نہیں...... کہاں جاتا ہے میرا حق......؟ اور زیاد... کو زیادہ دن تک یہ کھوج نہیں لگانی پڑی تھی۔

☆☆☆

موسم سرما عروج پر تھا۔ رات بھی شدید بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے ٹھنڈ میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ مگر صبح سورج نکلنے کی وجہ سے گھروں کے صحن پُررونق ہو گئے تھے۔ اتوار کا دن تھا، اس لیے ہر گھر سے بچوں کی چہکار کی آواز آتی بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ پروفیسر صاحب بھی طبیعت میں گرانی کے کارن آج گھر میں موجود تھے۔ حالانکہ چھٹی کے دن وہ کبھی گھر

میں نہیں ٹکتے تھے۔ ضرور کسی نہ کسی کے بلاوے پر گھر سے باہر ہوتے تھے۔ اس وقت وہ دھوپ کا لطف اٹھاتے تازہ اخبار کی سطر، سطر پڑھنے میں مصروف تھے۔ امی کچن میں ابو کی پسند کے پکوان بنانے میں لگی تھیں کہ کوئی تو دن ہوتا تھا جب شوہر سارا دن گھر میں موجود ہوتے تھے جبکہ دادی اماں حسبِ معمول ملازمہ سے پنڈلیوں کی مالش کروانے کے بعد وہیں صحن میں کرسی ڈالے معمول کی تسبیحات پڑھنے میں مصروف تھیں۔ زیاد تک سک سے تیار کمرے سے باہر آیا تھا۔ آج اس کا پروگرام اپنے دوستوں کے ساتھ ان کی ہیوی بائیکس کو لانگ روٹ پر انجوائے کرنے کا تھا۔ مگر پروفیسر صاحب کو صحن میں موجود پا کر ٹھٹک گیا تھا کیونکہ وہ یقیناً اس کی تیاری دیکھ کر ٹھٹک جاتے۔ دل میں ہزار بہانے تیار کرتا وہ دبے قدموں باہر آیا تھا۔ پروفیسر صاحب کا چہرہ پوری طرح سے اخبار کے پیچھے چھپا ہوا تھا لہٰذا بنا چاپ کیے وہ صحن سے ملحق چھوٹی سی گلی میں کھڑی بائیک کو احتیاط سے گھسیٹ کر گلی کے آخری سرے پر بنے چھوٹے گیٹ سے باہر نکال لینا چاہتا تھا۔ پروفیسر صاحب کی پوچھ پڑتال سے بچ کر نکلنے کا یہ طریقہ خاصا احمقانہ تھا۔ روزانہ سیکڑوں طالب علموں کی چال سے ان کی شخصیت جانچ لینے والا معلم اپنی اولاد کے قدموں کی چاپ کیسے نہیں پرکھ سکتا......؟ زیاد نے بنا آواز کیے بائیک کو اسٹینڈ سے اتارا تھا اور چند قدموں کے فاصلے تک بائیک کو ابھی گھسیٹ پایا تھا کہ اس کے کانوں میں پروفیسر صاحب کی آواز آئی۔

”برخوردار......! سیانے کہتے ہیں کہ بائیک کو کک لگائی جائے تو وہ چلتی ہے، تم بھی ایسی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“ زیاد کا دل چاہا بائیک کو ایک زوردار دھکا دے اور صحن کی دیوار پر دے مارے مگر وہ ہمیشہ کی طرح بے بس تھا۔ اس نے پلٹ کر پروفیسر

صاحب کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی مگر آواز اخبار کے پیچھے سے آئی تھی۔ زیاد نے غور سے اخبار میں وہ سوراخ ڈھونڈنے کی کوشش کی جس میں سے انہوں نے زیاد کو تاڑا تھا۔ دادی اماں جو بیٹھے، بیٹھے اونگھنے لگی تھیں، الرٹ ہو کر پوتے کی طرف متوجہ تھیں۔ اب جواب دینے کے بغیر چارہ نہیں تھا تبھی بولا۔

''وہ اصل میں ابو...... یونیورسٹی میں فائنل سمسٹر چل رہا ہے اس لیے اسائمنٹس بنانے کے لیے سب دوست اکٹھے ہو رہے ہیں اور بائیک تو ویسے بھی دس منٹ لے ہی لیتی ہے، اسٹارٹ ہونے میں۔ بہت تنگ کرنے لگی ہے۔'' زیاد بوکھلا ضرور گیا تھا مگر بائیک کا خود ساختہ نقص بتانا نہیں بھولا تھا۔

''اچھا! لاؤ میں بھی تو دیکھوں ذرا......'' پروفیسر صاحب نے مصنوعی فکرمندی سے اخبار لپیٹا۔

''نہیں، نہیں ابو...... اتنی بڑی پرابلم نہیں ہے۔ آپ بیٹھیں......'' زیاد نے فٹافٹ بائیک پر بیٹھ کر اسے کک لگائی تھی۔ پروفیسر صاحب کے بقول...... بیوقوفانہ طرزِ عمل اس پر ختم تھا۔ اب بھی اپنے عمل سے اپنے بیان کی نفی کر بیٹھا تھا۔

''ہوں...... اچھا ہوا اسٹارٹ ہو گئی۔'' پروفیسر صاحب نے دوبارہ کرسی سے ٹیک لگائی اور بولے۔ ''نہیں تو مکینک کی خیر نہیں تھی برخوردار......! آخر پوری تسلی دی تھی اس نے بائیک کی حالت کے بارے میں۔''

دادی اماں نے باپ، بیٹے کی نوک جھوک پر بمشکل ہنسی دبائی تھی۔ زیاد جان چھڑاتا اسٹارٹ بائیک کو لے کر گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ گیٹ کی گھنٹی بج اٹھی...... اس نے بائیک پر بیٹھے، بیٹھے دروازہ کھولا، قدوسی صاحب تھے، پروفیسر صاحب کے قریبی دوست...... اس نے سلام کر کے انہیں اندر آنے کو کہا اور خود ان کے ذرا پہلو سے بائیک باہر لے جانے لگا تھا کہ قدوسی صاحب نے اسے روک لیا۔

''بیٹا! یہ رسید پروفیسر صاحب کو دے دو۔ ان سے کہنا کہ جن کو انہوں نے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے بھجوائے تھے، یہ ان کی طرف سے ہے۔ ابھی میں جلدی میں ہوں پھر کسی وقت آ کر تفصیلاً بات کروں گا...... ابھی چلتا ہوں......'' قدوسی صاحب ہوا کے جھونکے کی طرح آ کر چلے گئے۔ یہ جانے بغیر کہ زیاد کے دل میں لگی چنگاری کو ہوا دکھا گئے ہیں۔ ایک بیٹے کو باپ کے مقابل کھڑا کرنے کا سامان فراہم کر گئے ہیں۔ لمحوں میں زیاد کا دماغ سلگنے لگا تھا۔ اندرونی خلفشار اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ اس لیے کہ ابھی کل بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا تھا جب ایک دور پرے کی رشتے دار آ کر پروفیسر صاحب کی دریا دلی کے گن گا رہی تھیں اور اپنے کمرے میں موجود زیاد سب سن رہا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ بائیک کو مسلسل ریس دینے لگا تھا۔ اس کے بالکل پیچھے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے پروفیسر صاحب کا دل سکڑ کر پھیلا تھا، زبان جیسے خشک ہو کر تالو کو جا لگی تھی جو بھی تھا زیاد میں ان کی جان تھی مگر بلاشبہ وہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ ساری عمر نہ ڈرے تھے، نہ جھکے تھے۔

دادی اماں ساری صورتِ حال کی سنگینی جانچ کر زیاد کو آواز دے بیٹھیں۔ وہ نہیں چاہ رہی تھیں کہ اس وقت زیاد بائیک پر کہیں جائے...... جذباتی اور غصہ ور تو وہ شروع سے تھا۔ دادی اماں کی آواز سن کر زیاد نے لال بوٹی ہوتی آنکھوں سے پلٹ کر دیکھا تو نظر قریب کھڑے باپ کے مطمئن چہرے پر جا ٹکی۔ اور اگلے ہی لمحے رسید کی پرچی باپ کے پیروں میں پھینکتا وہ طوفان کی طرح بائیک نکال کر لے گیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ پروفیسر صاحب نے وہ رسید یوں جھپٹ کر اٹھائی تھی جیسے وہ رسید نہیں کوئی قیمتی خزانہ ہو......

☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی۔ مغرب کی اذانیں بلند ہونا

شروع ہو گئی تھیں۔ مگر اس گھر کا ایک بوڑھا، کمزور اور بیمار وجود جبکہ دو بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے نیم توانا نفوس صبح سے خالی پیٹ، صحن میں بیٹھے صرف جوان بیٹے کی راہ تک رہے تھے۔ امی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان کو تکا جہاں پرندے گھروں کو اڑان بھر رہے تھے۔

''زیاد تو بھی گھر لوٹ آ...... میرے بچے......''

ماں کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔ دادی اماں کا سردی کی شدت سے چٹختا بوڑھا چہرہ، جوان پوتے کے لیے فکر مند تھا تو نڈھال پروفیسر صاحب کا مضبوط دل بھی ہو چکا تھا۔ انہوں نے ماں کو بہت دفعہ اندر کمرے میں بھیجنے کی اور کچھ کھلانے کی کوشش کی مگر بے سود...... لاکھ باشعور سہی...... مدلل طرزِ گفتگو رکھنے والی عورت سہی...... اندر سے وہ روایتی دادی اماں ہی تھیں...... ''اصل'' سے زیادا نہیں بھی ''سود'' پیارا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے کتنے لمحے سر کے تھے کہ زیاد کی مخصوص ڈپلیکیٹ چابی کی کھنک نے ان ...تینوں کو زندہ کر دیا تھا۔ گیٹ کھلا اور زیاد خاموشی سے بائیک گھسیٹتا اندر چلا آیا۔ ان تینوں نے بائیک کی بدتر حالت کو دیکھا مگر کچھ بھی پوچھنے سے گریز کیا...... جو چیخ، چیخ کر کسی شدید ایکسیڈنٹ کا پتا دے رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ جس جذباتی کشمکش کا شکار ہو کر زیاد گھر سے نکلا تھا اس میں، اس کا بخیریت گھر واپس آ جانا غنیمت تھا۔ پروفیسر صاحب کے لبوں کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا تھا، بائیک کی حالت دیکھ کر خود کلامی کی۔

''خبیث! سچ میں بائیک ٹھوک آیا ہے، ناقابلِ استعمال بنانے کی ہر ممکن کوشش......'' بیٹے کو خیریت سے سامنے دیکھ کر دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دو چار تھپڑ بھی جڑ دیں۔ امی اور دادی اماں دونوں زیاد سے لپٹ، لپٹ جا رہی تھیں۔ دونوں ٹٹول، ٹٹول کر اس کے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مبادا کہیں خود کو بھی چوٹ لگوا لایا ہو۔

سنو لڑکی

سنو لڑکی......!

زمانے کی طرح تم نے کسی کے خواب دیکھے ہیں
اگر خوابوں کی تعبیریں کہیں زندہ بھی رکھی ہیں
تو اپنے پیار کی خاطر
زمانے کو کبھی بھی درمیاں اپنے نہیں لانا
زمانہ تو کسی کیدو سے ہرگز کم نہیں جاناں
سنو لڑکی......

شاعرہ: فریدہ فری...... لاہور

اصل جواب

ٹیچر: ''دو میں سے دو نکلے تو کیا بچا......؟''

اسٹوڈنٹ ''ہم کو سوال سمجھ نہیں آیا؟''

ٹیچر: ''تمہارے پاس دو روٹیاں تھیں تم نے ان کو کھا لیا اب تمہارے پاس کیا بچا؟''

اسٹوڈنٹ: ''سالن!''

از: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

ہنستے رہو

☆ چیونٹی رکشے میں بیٹھی اور پاؤں باہر رکھا۔

ڈرائیور: ''میم! پاؤں اندر کر لیجیے۔''

چیونٹی: ''نہیں راستے میں ہاتھی ملا تو لات مارنی ہے، کل منہ چڑا کر گیا تھا......''

☆☆☆

☆ لڑکی: ''آپ میری منگنی پر کیا تحفہ دیں گے؟''

سکھ: ''جو آپ کہو گی۔''

لڑکی: ''رنگ دے دینا۔''

سکھ: ''ٹھیک ہے پر اٹینڈمت کرنا بیلنس کٹ جاتا ہے۔''

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

''اب بس بھی کریں آپ دونوں...... آپ کا بیٹا دنگل جیت کر نہیں آ رہا بلکہ پورے شہر میں پھرتے آوارہ کتوں کی گنتی کر کے آ رہے ہیں برخوردار...... دیکھ نہیں رہیں خود کی حالت کیسی ہو رہی ہے؟ اور رہ گئی بائیک تو اس کا تیا پانچا آج نہیں تو کل لازمی تھا۔'' پروفیسر صاحب سارے دن کی کھولن اتارنا لازمی سمجھ رہے تھے جبکہ دادی اماں اور امی مسلسل انہیں آنکھ کے اشارے سے منع کر رہی تھیں۔ مگر پروفیسر صاحب مکمل فارم میں تھے۔

''کہاں تھے تم سارا دن......؟ گھر والوں کی فکر یا پروا بیچ کھائی ہے...... اور بائیک پر کیا ظلم ڈھایا ہے، ذرا یہ بھی بتا دو......'' پروفیسر صاحب کو خاموش کھڑے زیاد کی خاموشی سے جھنجلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

وہ شعوری طور پر اسے بلوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ رسید والے واقعے کے حوالے سے زیاد کا ردِ عمل جان لینا چاہتے تھے مگر وہ پروفیسر صاحب کے سوالات کے باوجود خاموش کھڑا کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے میں مصروف تھا۔ تبھی پروفیسر صاحب دھیرے، دھیرے چلتے بائیک کے پاس آئے اور جانچتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لینے کے بعد بولے۔

''چلو تمہاری مرضی تو پوری ہوئی اب...... نئی بائیک کا سبب بنا ہی لیا آخر......'' پروفیسر صاحب کی زبان سے الفاظ کیا ادا ہوئے، زیاد کے تھکے ہوئے اعصاب پہ گویا ہنٹر برس گیا، وہ یک دم پھٹ پڑا تھا۔

''مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی...... پاس رکھیے آپ...... اپنے پیسے...... آپ کے خزانے میں کمی آ جائے گی ورنہ...... آپ غیروں کو لاکھ دیجیے یا دو لاکھ...... مجھے پروا نہیں مگر اب مجھے آپ کے خزانے میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ جوڑ کر رکھیے، سنبھالیے اپنے خزانے کو سدا......''

''بکواس بند کرو زیاد......'' دادی اماں سے برداشت نہیں ہو سکا۔ تبھی تڑپ کر بولیں۔ ''کیا خزانہ، خزانہ لگا رکھی ہے؟ کون سی ایسی چیز ہے جو تم بچوں سے چھپا کر رکھی گئی ہے؟ کہاں گڑا دیکھ لیا تم نے ان دیکھا خزانہ......؟'' زیاد اس قدر متنفر ہو گا، کسی کو گمان تک نہیں تھا۔

''یہ تو پروفیسر صاحب کو پتا ہو گا ناں...... میں کیا جانوں......؟ مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ اوروں کے لیے ان کے پاس دینے کو لاکھ، لاکھ، ڈیڑھ، ڈیڑھ لاکھ کی رقم ہے، جو یہ خدا ترسی کرتے ہوئے دیے جا رہے ہیں مگر اپنے سگے بیٹے کے لیے...... اپنے خزانے میں سے محض ایک ہیوی بائیک کے لیے بھی پیسے نہیں دے سکتے تو پھر مجھے بھی کوئی پروا نہیں...... ان کا خزانہ، انہی کو مبارک......! مگر مجھے ساری عمر یہ دکھ ضرور رہے گا کہ تمام عالم کو علم کی روشنی بانٹنے والا میرا باپ ''بخیل'' ہے۔''

''زیاد......'' امی اس درجہ گستاخی پہ ششدر رہ گئی تھیں اور ان کا ہاتھ تھپڑ مارنے کے لیے اوپر اٹھا تھا جسے نرمی سے پروفیسر صاحب نے تھام کر نیچے کر دیا تھا۔

''مارلیں...... مارلیں کیا فرق پڑ جائے گا......؟ کم از کم مارنے کے معاملے میں تو بخل سے کام نہ لیں۔'' زیاد استہزائیہ انداز میں کہتا ہوا کمرے کا رخ کرنے لگا، جب اسے اپنے پیچھے پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔

''زیاد! ذرا میرے کمرے میں چلو...... آج میں تمہیں اپنا پوشیدہ خزانہ دکھا دینا چاہتا ہوں...... چلو...'' پروفیسر صاحب نے قدم بڑھائے تھے۔ زیاد نے حیرت اور بے یقینی سے پروفیسر صاحب کو دیکھا اور پھر بولا۔

''سچ میں......؟ دیکھیں ابو مجھے آپ کی دولت جائداد کی ہوس نہیں...... مگر میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کون سا ''خفیہ خزانہ'' ہے جو میں آپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی نہیں جانتا، جہاں سے دنیا بھر کی

امداد کے لیے بڑی، بڑی رقمیں نکل آتی ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی زیاد کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا اور کہیں دل میں شرمندگی کا احساس بھی جگہ بنا رہا تھا۔

''ہے...... واقعی ہے، ایسا خفیہ خزانہ ہے جو تمام کائنات کے خزانوں پر بھاری ہے مگر میں زندگی میں اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا یہاں تک کہ مجھے موت آ جائے۔'' پروفیسر صاحب کے ٹھنڈے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا جس نے زیاد کے احساسات کو پل بھر کے لیے منجمد کر دیا تھا۔

''اور میں......؟'' زیاد نے سینے پر انگلی رکھ کر باپ سے سوال کیا۔

''کیا میرے نفع کے لیے ہے وہ خزانہ......؟''

''نہیں، تم بھی اس سے زندگی میں نفع نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی موت آ جائے......''

امی اور دادی اماں نے کلیجے تھامے تھے جبکہ زیاد کی آنکھیں شدت حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔

''اور یاد رکھو تم نے وہ خزانہ اگر اپنی اولاد کو منتقل کیا تو وہ بھی اس سے قبل از مرگ نفع نہیں اٹھا سکتی...... اب چلو میرے ساتھ کمرے میں، باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ آپ دونوں خواتین یہیں رکیے......'' پروفیسر صاحب نے ماں اور بیوی کو مخاطب کیا۔ ''اور ایک باپ کے اپنی اولاد کے سامنے سرخرو ہونے کی دعا کیجیے گا۔'' آخری فقرہ کہتے، پروفیسر صاحب کا لہجہ بھرا گیا۔ زیاد، باپ کے قدم پہ قدم رکھتا ان کے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔

پروفیسر صاحب نے اسے دروازہ بند کرنے کو کہا اور خود دھیرے سے پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔

''میری الماری کا دایاں پٹ کھولو......'' پروفیسر صاحب نے دروازے پر جمے کھڑے زیاد کو کہا۔ ''اب نچلی دراز کو کھولو اور اس کے پچھلے خانے میں چھوٹا سا ڈبا رکھا ہے۔ اسے نکال لاؤ۔'' زیاد کسی معمول کی طرح پروفیسر صاحب کے کہے کے مطابق عمل کرتا ہوا دراز کھولنے لگا۔ دراز کے پچھلے خانے میں واقعی ایک چھوٹا سا خستہ حال لکڑی کا ڈبا پڑا تھا۔ زیاد نے اسے نکال کر ہاتھوں میں لیا اور پہلی سوچ اس کے دماغ میں جو آئی وہ یہ تھی۔

''اتنے چھوٹے ڈبے میں...... بڑا خزانہ......؟ شاید سونے کے بسکٹ......؟'' ایک میٹھی، میٹھی سی لہر زیاد کے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے زیاد کی شخصیت پر جو ٹیگ ہمیشہ نصب کیے رکھا تھا۔

''احمقانہ خیالات + احمقانہ حرکات = زیاد......'' وہ واقعتاً اس پر فٹ بیٹھتا تھا۔

''اسے میرے پاس لے آؤ۔'' نامعلوم ابھی کتنی دیر زیاد کا وجود میٹھی، میٹھی لہروں کے سپرد رہتا جبھی اسے پروفیسر صاحب نے پکار لیا۔ اس نے خاموشی سے پلٹ کر باکس باپ کے حوالے کیا اور خود قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

پروفیسر صاحب چند لمحے گہری سوچتی نگاہوں سے اس باکس کو تکتے رہے۔ زیاد کو اس لمحے باپ کی آنکھوں میں واضح نمی دکھائی دی تھی پھر انہوں نے باکس کا چھوٹا سا ختہ ہک ہٹا کر اس کا ڈھکن کھول دیا۔ زیاد نے خوشی اور تجسس کے تحت کچھ اچک کر اس باکس میں جھانکا اور پھر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس میں ڈھیروں کاغذ اور بوسیدہ رسیدوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف تو پرانی رسیدوں کا چھوٹا سا بنڈل پڑا تھا جو سارا کا سارا پیلا پڑ چکا تھا۔ پتا نہیں کس صدی کے کاغذ تھے۔ ان ان گنت چھوٹے کاغذوں اور رسیدوں میں زیاد کو کام کی کوئی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سخت مایوس ہوا تھا۔ اسے پروفیسر صاحب پر شدید غصہ آ رہا تھا جو اسے بے وقوف بنا رہے تھے مگر ضبط کیے بیٹھا رہا اور پھر پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔

''تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ان رسیدوں اور کاغذ کے ٹکڑوں کے لیے تمہارا کوفت بھرا تجسس ختم

کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل میں جاؤں گا۔'' زیاد نے فوراً چہرے کے تاثرات نارمل کیے پروفیسر صاحب باپ تھے، جان گئے تھے بیٹے کے جذبات......

''تمہارے دادا رحمت اللہ ٹھیٹ کاروباری آدمی تھے۔ صرف اپنے گھر والوں کی نظر میں اور انتہائی خدا ترس اور ہمدرد تھے دنیا کی نظر میں...... تمہاری طرح ہمیں بھی ان سے شکایتیں تھیں۔ پیسے کی کمی کی...... مانگیں پوری نہ کرنے کی...... عیش و عشرت کا سامان مہیا نہ کرنے کی...... ان کا کام محض گھر میں راشن ڈالنا اور بھول جانا تھا۔ اماں کو لگا بندھا پکڑاتے تھے اور پھر اماں ہوتیں اور ان کے رونے...... وہ کیسے ہم بہن بھائیوں کی ضرورتیں پوری کرتیں، کیسے فیسیں دیتیں۔ ابا جی کو کبھی سروکار نہیں تھا ان باتوں سے۔ بہت سے گلے شکوے دل میں لیے ہم بہن بھائی اپنے، اپنے ٹھکانے لگے اور ابا جی اپنے آخری ٹھکانے...... اور پھر جس دن وہ مرے اس دن ہم پر کھلا کہ ابا جی محض ہمیں یتیم نہیں کر گئے بلکہ ایک دنیا کو بے آسرا چھوڑ گئے۔ ان کی میت پر ان کی اولاد سے زیادہ رونے والے انجان لوگ تھے۔ جو روتے جاتے اور ہمیں بتاتے جاتے تھے کہ کس کے گھر کا چولھا ابا جی کے دم سے جلتا تھا۔ کس کی بیٹی ابا جی کی وجہ سے بیاہی گئی...... کس کو روزگار ابا جی نے دلایا۔ کسی کا کچھ اور کسی کا کچھ اور بہت سے لوگوں کا بہت کچھ ابا جی اپنے سنگ سمیٹ کر لے گئے۔

بہت دن بعد جب میں نے ابا جی کی دکان کھولی تو وہاں کسی کونے کھدرے سے مجھے یہ ڈبا ملا...... بالکل ایسا ہی تجسس میرے دل میں بھی جاگا تھا جیسا تمہارے دل میں ابھرا تھا۔ میں نے بھی یہی گمان کیا کہ میرے ہاتھ نہ جانے کیسا خزانہ لگنے والا ہے......

شکر تھا ابا جی کو ہمارا خیال تو آیا...... ساری عمر دوسروں کو بھرتے رہے اب مرنے کے بعد ہمیں بھی کچھ نواز ہی گئے۔

مگر جیسے ہی میں نے ڈبے کا ڈھکن ہٹایا......

ڈھیر سارے چھوٹے، چھوٹے کاغذ کے پرزے میرا منہ چڑا رہے تھے...... بالکل ویسا ہی تاثر اور غصہ میرے دل میں بھی جاگا تھا جیسا ابھی میں نے تمہارے چہرے پر دیکھا تھا...... میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا اور ان کاغذ کے پرزوں کو دیکھنے لگا۔ عجیب سی بات تھی...... ہر دوسرے پرزے پر تقریباً ایک جیسی عبارت لکھی تھی۔

''لالہ رحمت اللہ...... دس روپے کی روٹی''

''لالہ رحمت اللہ...... پانچ روپے کی روٹی''

''لالہ رحمت اللہ...... سات روپے کی روٹی''

میں نے باقی کاغذوں کو بھی پھرول کے دیکھا جن میں سے کافی ساری تو رسیدیں تھیں اور کسی میں چھوٹی، چھوٹی سی لکھائی میں پیسوں کا حساب کتاب لکھا تھا۔ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں لگا تھا کہ میرے دائیں ہاتھ میں پڑی چوکی پہ محمد دین چاچا آ کر بیٹھ گئے۔ چاچا محمد دین ابا جی کے بہت قریبی یار دوستوں میں سے تھے۔ بالکل سامنے ہی ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ ابا جی کی دکان کھلی دیکھی اور مجھے اس میں موجود پا کر اٹھ کر میرے پاس چلے آئے...... میں ان سے ملنے کے لیے اٹھنے لگا تو مجھے کندھے سے تھپک کر بٹھا دیا۔ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں...... شاید ابا جی کی یاد نے چٹکی لی تھی۔ دونوں کی بیٹھک بھی بڑی تھی ایک دوسرے کے ساتھ...... میرے ہاتھوں میں موجود ڈبے اور اس میں موجود کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھ میں مجھ سے پوچھنے لگے۔''

''کیا دیکھ رہا ہے محمود پتر......؟ کیا ڈھونڈنا چاہ رہا ہے؟'' ان کی نظروں میں ناقابلِ فہم سا تاثر تھا۔ مجھے عجیب طرح کی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں چاچا جی...... وہ میں بس...... یونہی...... آج ویسے ہی دکان کھولنے کو جی کیا تو چلا آیا...... سوچا کہ......'' میں نے جواب دیا۔

''کیا سوچا......؟'' چاچا نے میری بات اچک لی۔

''یہی کہ تیرا باپ اس دکان میں تم لوگوں کے لیے کون سا خزانہ چھپا کر گیا ہے؟'' چاچا سر جھٹک کر دھیما سا ہنسے جبکہ میں شرم سے پسینے، پسینے ہو گیا۔

''شرم نہ کھا پتر...... آخر جو ہے تم سب کا ہی ہے۔ وارثت کے لیے شرم کیوں کھائی...... پر پتر ترکہ تو، تو ہاتھ میں تھام کر بیٹھا ہے۔'' چاچا نے میرا دھیان ڈبے کی طرف کرایا۔

''کیا...... یہ ڈبا......؟ ہمارا ترکہ......؟''

مجھے لگا چاچا دین محمد پگلا گیا ہے...... کیسی عجیب بات کر رہا تھا ناں......؟ بھلا کبھی کسی باپ نے اولاد کے لیے وراثت میں پرچیاں بھی چھوڑی ہوں گی......؟ مگر میں اپنے مرے باپ کے لیے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ مجھ میں برداشت اور تحمل بہت زیادہ تھا کہ ایک یہ واحد چیز تھی جو ہمارے باپ کی طرف سے ہم بچوں کو وافر ملنے والی سہولت تھی کیونکہ کسی بھی دکھ، درد، تنگی، ترشی میں اس خصوصیت کا موجود ہونا ہی کسی سہولت سے کم نہیں ہوتا......

''کیوں تاؤ کھا رہا ہے پتر......؟'' چاچا محمد دین کی آواز نے میرے خیالات کی ڈور کھینچی......

مجھے چاچا کے درست قیاس پہ حیرت بھی ہوئی۔ یہ پرانے وقتوں کے بابے، بابیاں (بوڑھے، بوڑھیاں) آپ کے کچھ نہ بھی لگتے ہوں تو پھر بھی آپ کی سوچیں سگے ماں، باپ کی طرح پڑھ لیتے ہیں۔''باپ پہ غصہ نہ کر...... تیرا باپ بڑا درویش آدمی تھا۔ تم لوگ جو بھی سمجھو...... پر دنیا جانتی ہے کہ وہ ننگے کو کپڑا اور بھوکے کو نوالہ دینے والوں میں سے تھا۔ یہ جو ڈبا تیرے ہاتھوں میں ہے ناں...... اگر تیری عقل سے پا جائے تو یہ سچ میں خزانہ ہے۔ اس ڈبے میں تیرے باپ کا کردار بند ہے۔ اس کی خدا ترسی، ہمدردی اور غریبوں کی دعائیں جمع ہوئی رکھی ہیں۔ سچ پوچھ تو اس میں لوگوں کی وہ گواہیاں بند ہیں جنہیں تیرے میرے جیسے فقیر روزِ قیامت اپنے نیک اعمال کا وزن زیادہ کرنے کو، حلق سے باہر زبانیں لٹکائے ڈھونڈتے پھریں گے۔ یہ جو تو پرچی دیکھ رہا ہے ناں......'' چاچا نے ہاتھ بڑھا کر وہی پرچی تھامی جس پر لکھا تھا۔

''لالہ رحمت اللہ، دس روپے کی روٹی......''

''یہ تیرے باپ کا روز کا کام تھا...... سامنے جو یونس ہوٹل ہے ناں...... اُدھر تیرے باپ نے کہہ رکھا تھا کہ دن بھر میں جو فقیر، غریب خواہ ضرورت مند یا ڈھونگی، لالہ رحمت اللہ کا نام لے کر روٹی مانگے تو اسے کبھی نہ مت کہنا۔ جتنا مرضی کھا لے، کھانے دینا اور رات میں ایک ہی دفعہ حساب کی پرچی میری دکان پر پہنچا دینا...... یہ پرچیاں اسی کھاتے کی ہیں۔ روزانہ نہ جانے کتنے جھوٹے تو کتنے سچے آ کر کھانا کھاتے اور تیرا باپ بل چکاتا۔ اصل میں جو بھی رحمت اللہ کی ہٹی پہ مانگنے آتا وہ اسے سامنے ہوٹل روانہ کر دیتا۔ دیکھا، دیکھی وہ لوگ بھی جانے لگے جنہیں تیرے باپ نے نہیں بھیجا ہوتا تھا۔ مگر پھر رحمت اللہ کو ساری دیہاڑی (دن) کی چاہے دس روپے کی روٹی پڑتی یا پندرہ کی...... اس کے متھے کبھی وٹ نہیں پڑا (اس زمانے میں دس روپے کی بھی اہمیت بہت زیادہ تھی) حاجی کرم دین کے پتر کو دکان تیرے پیو (باپ) نے ہی ڈال کر دی تھی۔ جس سے اس غریب کے بچے پلنے شروع ہوئے، کمہاروں کا منڈا دبئی کیسے پہنچ گیا......؟ تیرے باپ کے دیے ادھار سے، جو کبھی واپس نہیں ہوا۔ رحمت اللہ روز رات کو اپنا دیا ہوا معاف کر کے سونے والوں میں سے تھا۔

یہ جو ادریس ہے، پچھلی گلی میں جھگی ڈال رکھی ہے جس نے...... وہ جب عیسائی سے مسلمان ہوا تو اسے کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ مسلمان اب بھی اس سے کھج (کراہیت) کھاتے اور عیسائی پوچھتا نہ تھا۔ تو تیرا باپ ہی تھا جس کی دکان سے

یہ مرد بھی ناں......

تنگیِ نفس کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا کہ پولن الرجی نے شدید حملہ کر دیا تھا......اور رات کے اس پہر میں بے بسی میں یوں سانس کیا لے رہی تھی لگتا تھا ابھی دم گھٹ جائے گا۔

شوہرِ نامدار اپنی اسٹڈی روم میں کانوں پر ہیڈ فون لگائے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مطالعہ اور موسیقی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ گرتی پڑتی ان کے کمرے میں اشاروں سے اپنی حالتِ زار بتائی۔ میری طرف متوجہ ہوئے، ہیڈ فون اتار کر احوال پوچھا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں! (یہ جملہ ان کا دل جلایا کرتا تھا) اگر ایمرجنسی میں جلدی نہ لے جایا گیا تو حالت بگڑ بھی سکتی تھی۔ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے، گاڑی نکالی اور مجھے ایمرجنسی سیکشن میں اسپتال لے گئے۔ راستہ بھر...... بولتے رہے، یہ بے وقت کیوں بیمار ہوئیں' یہ کون سا وقت ہے بے آرام کرنے کا...... میں ان کی عادت سے واقف تھی سنتی رہی...... خیر اسپتال میں آلۂ بحالیِ تنفس میرا مطلب ہے آکسیجن سے میری بے ربط سانس بحال ہوئی اور قریباً ایک گھنٹے بعد میں پُرسکون سی ہو کر گھر آ کر سوگئی۔

شب و روز گزرتے رہے۔ ایک رات ٹھیک ایک بجے مجھے نیند سے جگایا اور کہا کہ میری طبیعت خراب ہے اسپتال جانا ہے۔ ہمارا ڈرائیور شام کو واپس اپنے گھر چلا جاتا تھا......سو میں نے اپنے بیگ میں کچھ رقم ڈالی اور انتہائی تیزی سے انہیں اسپتال لے آئی۔ ایمرجنسی میں بیٹھے ڈاکٹر اور عملے نے انہیں فوری امداد دی۔ لائف سیونگ انجکشن لگایا اور ایڈمٹ کر لیا کہ اب مریض آرام سے ہوگا۔ اگلے چند روز وہ انتہائی نگہداشت کے کمرے میں تھے۔ اور ڈاکٹر مسلسل ان کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ اور میں کمرے کے باہر بیٹھی ان کی صحت یابی کے لیے دعاؤں میں مصروف تھی۔ بارہا یہی خیال آتا کہ انسان پہ یہ افتاد کسی بھی وقت آ سکتی ہے اب ان سے کیا کہتی کہ دن کی روشنی میں آپ کیوں بیمار نہ پڑے...... یہ کون سا وقت تھا مجھے بے آرام کرنے کا؟

بعد میں، میں سوچتی رہی کہ اس روز وہ سارا دن کیوں بے چین سے لان میں چہل قدمی کرتے رہے تھے کہ شاید انہی باتوں کی بازگشت پر غور کر رہے تھے......؟ ویسے عام حالات میں بے حد خیال اور محبت کرنے والے انسان تھے اور میں ان کو یہ بات یاد دلا کر خوب چھیڑ خانی کرتی صرف مسکراہٹیں ہوتیں چہرے پر......

تحریر: فریدہ افتخار، اسلام آباد

اسے راشن پانی جاتا تھا۔ کون، کون سے بندے گنواؤں تجھے......؟ میں مانتا ہوں پتر کہ تم بچوں کے لیے تمہارا باپ کوئی لمبی چوڑی جائداد چھوڑ کر نہیں مرا......مگر پتر اس غریب پرور کی مدد رب نے اس طرح کی کہ آج اس کی ساری اولاد کسی نہ کسی لائق ہو چکی ہے تو بھی بہت سا پڑھ گیا...... بہنیں تیری بیاہی گئیں۔ بھائی تیرا کمائی سے لگ گیا......

پتر محمود......! تیرے باپ نے یہ ڈبا دنیا دکھاوے کو نہیں بھرا......وہ تو تاریکیوں میں گھروں کو راشن ڈھوتا تھا۔ یہ ڈبا وہ تم لوگوں کے لیے اس لیے چھوڑ گیا کہ شاید اس کی کسی اولاد کے ہاتھوں اس کے خزانے میں وادا (زیادتی) ہوتا رہے۔ اس نے ان اعمال کے اجر کے لیے دنیا میں آس نہیں لگائی تھی۔

وہ تو کہتا ہی اس کو "وڈے دن کا خزانہ......" (روزِ حشر کا خزانہ) تھا جو پتر ہر کوئی اکٹھا نہیں کر پاتا...... تیرے میرے جیسے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ بڑی، بڑی باتیں کرنے والوں کے کام بھی بڑے ہوں، یہ ضروری نہیں ہوتا کبھی کبھار بازی وہ لوگ مار لیتے ہیں جو کم فہم سمجھے جاتے ہیں۔ اب یہ تجھ پہ ہے کہ پتر کہ اپنے باپ کے لیے صدقۂ جاریہ بن جا اور ڈال تارہ اس خزانے میں اعمال کے موتی اگر نہیں تو اٹھ اور سامنے والے نالے میں روڑ (بہا) آ...... تیرے باپ کی روح یقیناً سمجھ جائے گی کہ اس کی اولاد اس کا ترکہ سنبھال نہ سکی۔ اس کی چھوٹی جائداد نالے کے نذر ہوگئی......" چاچا محمد دین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کندھے پر پڑا صافہ اتار کر اپنی آنکھیں صاف کیں پھر کھڑے ہو کر میرا کندھا تھپک کر دکان پار کر گئے جبکہ میں وہیں پہ بیٹھا سود و زیاں کا حساب کرتا رہ گیا۔ کیا پایا تھا میں نے......؟

چوبیس سالہ زندگی میں...؟ کون سا دن ایسا تھا جو میں نے ابا جی کے ڈھب پر گزارا ہو؟ کس کی طرف سے مجھے کبھی کوئی رسید یا پرچی موصول ہوئی تھی؟

بس! وہ وقت مجھ پر ٹھہر گیا پھر میں نے ماضی دیکھا نہ مستقبل...... میں نے حال میں رہتے ہوئے آخرت کی فکر شروع کی...... رسیدیں اور پرچیاں اکٹھی کرنی شروع کیں۔ ابا جی کی طرح لوگوں کے گھروں میں راشن ڈالنے شروع کیے۔ بیروزگاروں کو کسی کام دھندے سے لگوایا...... کسی کی بیٹی کی شادی کا فرنیچر تو کسی کی بیٹی کی بارات کا کھانا، کسی غریب کی ٹپکتی چھت کو مرمت کروایا تو کسی کو علاج کی غرض سے رقم فراہم کی...... اور ان تمام کاموں کی رسیدیں وصول کیں...... اس لیے نہیں کہ کل کو میں مروں تو دنیا میرے لیے واہ، واہ کرے بلکہ اس لیے کہ جیسے میں نے ابا جی کے شروع کیے اس سلسلے کو آگے بڑھایا، ویسے ہی میری اولاد اس خزانے میں اپنا حصہ ڈال سکے لیکن......" پروفیسر صاحب نے جو بڑی دیر سے اپنی دُھن میں ماضی کی کھرچن، کھرچ رہے تھے لمحے بھر کو رکے اور بے جان بت کے مانند بیٹھے اپنے واحد اور جان سے عزیز بیٹے کو دیکھا۔

"لیکن ہم ایسے (خزانے) پائیں...... مرنے کے بعد...... یہاں تک کہ ہم حشر میں اٹھائیں جائیں گے۔ تب ہم اس خزانے کو پائیں گے اجر کی صورت، جزا کی صورت...... جنت کی صورت...... میں بخیل نہیں ہوں زیاد...... میں قطعاً بخیل نہیں ہوں، اللہ جانتا ہے میں نے اپنی اولاد کی خوراک، رہائش، پڑھائی، تربیت و پرورش میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمہیں مجھ سے اس قدر گلے ہیں...... میں تمہیں اب بھی چھوٹے سے بچے کے مانند دیکھتا ہوں، اولاد کبھی ماں، باپ کے لیے بڑی نہیں ہوتی، میں تمہیں دودھ پلواتا ہوں کیونکہ میں اپنے بچے کے لیے اسے بہتر سمجھتا ہوں...... بادام کھلاتا ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میرے پڑھائی میں جتے بیٹے کے دماغ کو بادام تقویت دیں گے......

میں تمہیں دس بجے کے بعد گھر سے باہر نہیں جانے دیتا ہوں کہ دل سوکھے پتے کے مانند تھر تھراتا ہے جب میرا بچہ رات گئے تک باہر رہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا لائق بچہ شہر کے بہترین کالج اور یونیورسٹی کے قابل ہے سو میں نے اس کا ایڈمیشن وہیں کرایا اور...... اور مجھے لگتا ہے کہ میرا بیٹا ہیوی بائی کے قابل نہیں ہے وہ اس پر بیٹھ کر ہوا سے باتیں کرے گا، وہ اس پر سوار ہو کر بے پروا ہو سکتا ہے، وہ بھول سکتا ہے کہ اس کی ریش رائڈنگ خدانخواستہ اسے کسی نقصان سے دوچار کر سکتی ہے بس...... اتنا سا قصہ ہے میرے بیٹے......"

پروفیسر صاحب بات مکمل کر کے آنکھیں موندے گہری، گہری سانس لینے لگے...... تھکن جیسے رگ، رگ میں سرایت کر گئی تھی۔

"میں کنجوس نہیں ہوں، میں اپنی آخرت کے لیے ڈر چکا ہوں، تمہارے تو آگے لمبی زندگی پڑی ہے انشاء اللہ...... مگر میرے بچے...... میرا توشہ خالی ہے...... مجھے اپنی خالی جھولی کو اس خزانے سے بھرنے دو...... خدا کا واسطہ ہے تمہیں...... میں اور کتنا جیوں گا ......سب تمہارا ہی ہے مگر زیاد...... میرے بچے...... مجھے خالی ہاتھ مت جانے دو، مجھے اکٹھا کر لینے دو......"

اتنا کہہ کر پروفیسر صاحب بچوں کے مانند رو دیے۔ انہوں نے بیٹے کے سامنے اپنی پٹیھ ننگی کی تھی۔ وہ دکھ کی اتھا گہرائیوں میں ڈوب گئے تھے۔ انہیں خبر تک نہیں تھی کہ زیاد پہ کیا بیت گئی۔ وہ شدید سردی میں پسینے میں ڈوبا گہری، گہری سانس کھینچ رہا تھا۔

☆☆☆

"اُف...... ! پشیمانی سی پشیمانی تھی...... کیا سمجھتا رہا وہ اپنے باپ کو اور وہ کیا نکلے...... کیا وہ ایسے دادا کا پوتا یا ایسے باپ کا بیٹا کہلانے کا مستحق تھا؟ میں اپنے دھندوں میں الجھا رہا اور میرا باپ اپنے اور میرے لیے آخرت کا سامان کرنے میں لگا رہا اور اگر اب بھی میں اللہ کی رسی کو تھام نہ پاتا تو......؟" زیاد کا پسینے، پسینے ہوا جسم زوردار جھٹکا کھا گیا اور اس جھٹکے کے نتیجے میں وہ پروفیسر صاحب کے قدموں میں پڑا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں ابو......! میں بدبخت ہوں، کم ظرف ہوں، میں باپ کو آزمانے چلا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ میری خود کی زندگی آزمائش بن جاتی تو......؟ میں آپ سے بدتمیزی کرتا رہا۔ آپ کو بخیل اور کنجوس سمجھتا رہا...... میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کے اعمال روزِ حشر مجھے بھی خاک سے لاکھ کا کر دیں گے...... جو میں آپ کے قدم پہ قدم رکھ لوں...... مجھے معاف کر دیں ابو...... پلیز......" زیاد رو رہا تھا اور زیاد کے رونے سے پروفیسر صاحب کا دل رو رہا تھا۔ انہوں نے جھک کر پیروں پہ گرے بیٹے کو اٹھایا، اس کی پیشانی چومی...... پھر بولے۔

"میں نے تمہیں معاف کیا...... ہمارا رب بھی ہمیں معاف کرے...... آج میں بہت آسودہ حال ہو گیا ہوں۔ میرا بیٹا، میرے ساتھ آن کھڑا ہوا ہے۔ تم نے مجھے خوشیوں سے بھر دیا ہے اور باپ کو خوش کر کے اپنے خزانے کو نیکیوں سے......" آخری جملہ کہتے ہوئے پروفیسر صاحب کا لہجہ ہلکا سا شرارتی ہوا تھا۔

"اب میں باہر جاتا ہوں ابو......! دادی اماں اور امی سخت پریشان ہوں گی......" زیاد تیزی سے اٹھا اور باہر نکلنے کے لیے قدم دروازے کی سمت بڑھا دیے۔

"زیاد......؟" عین اسی وقت پروفیسر صاحب نے پیچھے سے پکارا۔

"جی ابو......" وہ پلٹا۔

"مجھے اچھا لگتا ہے، جب تم مجھے وہ کہتے ہو۔"

"وہ کیا ابو......؟"

"پروفیسر صاحب......" اور پروفیسر صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ان کے خوب صورت قہقہے میں زیاد کی چہکار بھی شامل تھی۔



دوسرا اور آخری حصہ

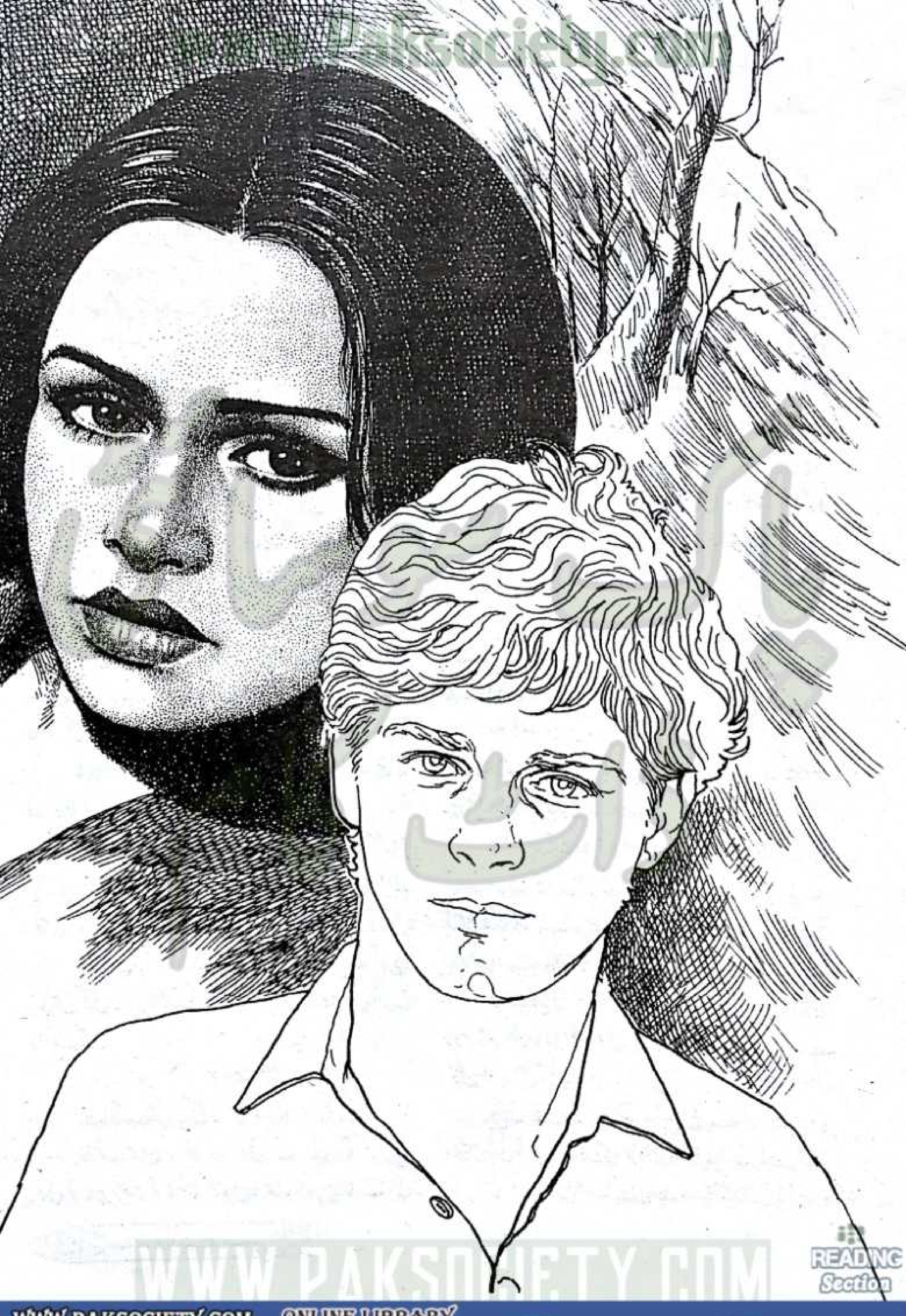
ناولٹ

گہر میں

نایاب جیلانی

''ڈیڈی، ممی سے کہیں وہ آجائیں۔'' حمنہ، ماہر کے کندھے سے لٹک رہی تھی...... اور وہ اسے سمجھا رہا تھا تسلی دے رہا تھا۔

''ممی آجائیں گی بیٹا! آپ فی الحال ماما سے کام چلالو......'' اس کا اشارہ عون کی شرٹ کے بٹن لگاتی فاطمہ کی طرف تھا۔ فاطمہ نے تیکھے انداز میں اسے گھورا۔ بچی کو تسلی دینے کا یہ کیسا انداز تھا؟ وہ اسے طریقے سے سمجھاتا...... حورعین واپس نہیں آسکتی وہ



مر چکی تھی تاکہ بچی کو اس حقیقت کا اندازہ ہو سکتا۔
فاطمہ نے سوچا...... وہ خود کسی دن طریقے سے حورعین کے بارے میں حمنہ کو بتا دے گی۔ یوں تو حمنہ اسی انتظار میں رہے گی کہ اس کی ماں کسی دوسرے ملک گئی ہوئی ہے اور وہ جلد حمنہ کے پاس لوٹ آئے گی۔ کم از کم بچی کا مائنڈ سیٹ تو کرنا چاہیے تھا۔ یہ ماہر بھی ناں......
''تو آپ بتائیں ناں...... وہ کب آئیں گی۔ حور ممی کب آئیں گی؟'' حمنہ کا انداز ٹھنکتا ہوا تھا۔ وہ اپنی ماں کو شاید بہت مس کر رہی تھی۔
''حور ممی تو جنت میں چلی گئی واپس کہاں سے لوٹے گی۔'' فاطمہ کی بڑبڑاہٹ پر ماہر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر دوبارہ حمنہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فاطمہ کو اس کے چہرے پر ایک عجیب تاثر دکھائی دیا تھا۔ یہ کس قسم کا تاثر تھا؟ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔
''میں ڈیڈی کو بھی مس کرتی ہوں...... ڈیڈی پاس ٹائم نہیں...... بھی، کبھی ڈزنی لینڈ کر جاتے ہیں۔'' اب حمنہ شاید ماہر سے شکوے کر رہی تھی۔ کیونکہ ماہر بچوں کو کم ہی وقت دے پاتا تھا۔
''تمہارا ڈیڈی الو کا......'' ماہر نے اونچی آواز میں کہا۔ حمنہ نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی تھی...... فاطمہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔
ماہر بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اسے فاطمہ کی ہنسی بہت بھلی لگی تھی۔
''انسان کو سالوں بعد نہیں، اکثر مسکرانا چاہیے۔'' ماہر کوئی تبصرہ نہ کرتا...... یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔
فاطمہ کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔ ماہر نے گہری سانس کھینچی۔ وہ فاطمہ کی الٹ کھوپڑی سے اچھی طرح واقف تھا۔

☆☆☆

نیویارک میں یہ صبح خاصی سرد اور برفیلی تھی۔
فاطمہ، عون اور محمد کو اسکول کے لیے جگا کر نیچے آئی تو ماہر، حمنہ کو ناشتا کروا چکا تھا۔ میز پر ناشتے کی باقیات موجود تھیں۔ کوکنگ رینج پر آئل اور انڈے کے چھلکے پڑے تھے۔
فاطمہ کو سخت تاؤ چڑھا۔
''حمنہ کے لیے ہر روز کیا تم ہی ناشتا بناتے ہو؟'' خالی برتن اٹھا کر اس نے ڈسٹر سے میز صاف کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔
''نہیں، تم بناتی ہو۔'' اورنج جوس پیتا ماہر لمحے بھر کے لیے چونک گیا۔
''تو پھر آج یہ تردد کیوں کیا......؟'' اس کا غصہ کمال کا تھا۔ ماہر خواہ مخواہ ہی مسکرا دیا۔
''حمنہ جا رہی تھی۔ میں نے سوچا اسے ناشتا کروا دوں......'' ماہر کو بتانا پڑا تھا۔ فاطمہ نے عادتاً نہیں سوچا کہ حمنہ اتنی سویرے کہاں جا رہی تھی۔ اسے ماہر کی اتنی ایفی شینسی دکھانے پر غصہ آ رہا تھا۔
''آئندہ بھی حمنہ کا ناشتا خود ہی بنا لینا۔'' اس نے تاؤ کھا کر کہا۔ حمنہ کا ہاتھ پکڑ کر اوپر جاتا ماہر لمحے بھر کے لیے رک گیا تھا۔
''ایسی نوبت آئندہ نہیں آئے گی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ فاطمہ بغیر بات کو سمجھے جلدی، جلدی بچوں کا ناشتا بنانے لگی تھی۔ ماہر، حمنہ کو لے کر اوپر چلا گیا تھا۔
معاً ڈور بیل کی آواز نے اسے متوجہ کیا۔ وہ جلدی سے ہاتھ صاف کر کے باہر آئی۔ آئی لینس میں دیکھا تو باہر ایک جانا پہچانا چہرہ دکھائی دیا تھا۔
فاطمہ نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے فریش سی آمنہ کھڑی تھی۔ امر کی بیوی...... اس دن دریائے ہڈسن کے کنارے بنے پارک کے ریسٹورنٹ میں آمنہ نے بھی اسے ویلکم کیا تھا۔
فاطمہ کو یاد آ گیا...... اس نے اخلاقاً آمنہ کو سٹنگ روم میں بٹھایا اور خود اس کی خاطر مدارات کے لیے کچن میں چلی آئی۔
بلیک کافی کے ساتھ اسنیکس لے کر جب وہ واپس آئی تو آمنہ نے بھی مروتاً انکار کیا۔
''تم نے یہ تکلف کیوں کیا......؟''

''ایسا کچھ نہیں...... تم پہلی مرتبہ آئی ہو۔'' فاطمہ کو بھی خالہ کے ہمراہ پاکستان میں رہ کر مہمان نوازی کے طریقے آ گئے تھے۔

''میں پہلے بھی آتی رہی ہوں...... فرسٹ ٹائم نہیں آئی۔'' آمنہ نے مسکرا کر بتایا۔

''میری موجودگی میں تو پہلی مرتبہ آئی ہو......'' وہ بھی دھیمے سے مسکرائی تھی۔ آمنہ کو تائید کرنی پڑی۔

''تم اتنا عرصہ پاکستان رہیں...... پاکستان کیسا لگا؟'' اس نے گفتگو کا آغاز ہلکے پھلکے کلام سے کیا۔

''بہت اچھا...... لیکن جگہ وہی بہتر ہوتی ہے جہاں آپ کے بچے ہوں......'' فاطمہ کی مسکان نم سی ہو گئی تھی۔

''یہ بات تو ٹھیک کہی......'' آمنہ نے کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا...... اچانک فاطمہ کو امر کا خیال آ گیا۔ ماضی میں امر کے ساتھ...... فاطمہ کے بہت اچھے تعلقات رہ چکے تھے۔ اس دن کے بعد امر دوبارہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ فاطمہ خود حیران تھی...... امر یہاں کم، کم آتا تھا۔

''امر کہاں غائب ہے؟'' اس نے اخلاقاً پوچھا۔

''وہ تو بہت مصروف ہوتے ہیں...... اتنا لمبا چوڑا تو بزنس ہے۔'' آمنہ تفصیل بتانے لگی تھی۔

''اسے میرا پیغام دینا...... بہن بنایا تو تھا مگر نبھایا نہیں۔'' فاطمہ کو کیا کچھ نہیں یاد آ گیا تھا۔ ویسے بھی اس کے پاس شکووں کے کئی دفتر ہوا کرتے تھے۔

''یہ کام تم خود کر لینا...... میں اتنی بے تکلف نہیں......'' آمنہ مسکرائی۔ اب چونکنے کی باری فاطمہ کی تھی۔ کیا وہ اپنے شوہر سے بے تکلف نہیں تھی؟ وہ کیسی بیوی تھی؟

''کیا مطلب؟'' فاطمہ عادتاً ہونق ہوئی تھی۔

''مطلب یہ کہ میں حمنہ کی گورنس ہوں اور امر کی ہاؤس کیپر...... آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔'' آمنہ کے تفصیل بتانے پر وہ واقعی گم صم ہو چکی تھی۔ اسے جیسے حیرت کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ اتنی منجمد ہوئی کہ ماہر کو حمنہ کا بیگ اٹھا کر باہر جاتے دیکھ کر بھی نہ ٹھٹکی، نہ چونکی۔ پھر جب وہ حمنہ کو چھوڑ کر واپس آیا تو ذرا دیر کے لیے رک گیا۔

وہ تو ابھی تک اسٹیچو بنی ہوئی تھی۔ حالانکہ حمنہ نے جاتے ہوئے کئی مرتبہ اس کے گال چومے تھے...... اور کئی مرتبہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر یاد دہانی کروائی تھی۔

''ماما......! آپ نے ضرور آنا ہے، میں آپ کو اپنا باربی ہاؤس دکھاؤں گی۔'' اور حمنہ کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی...... حمنہ کہاں گئی تھی؟ اور کیوں گئی تھی؟ اس کا دماغ بری طرح سے چکرا گیا تھا...... پھر ماہر کو جاتا دیکھ کر وہ چیخ پڑی تھی۔

''حمنہ کہاں گئی ہے؟'' اسے اپنی ہی بازگشت اجنبی محسوس ہوئی۔ ماہر رک گیا پھر ذرا سا پلٹا بھی۔

''حمنہ بورڈنگ چلی گئی......'' ماہر آج عام دنوں سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ اتنا سنجیدہ کہ فاطمہ کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ کیا وہ حمنہ کے چلے جانے پر اپ سیٹ تھا؟ لیکن حمنہ کو اس نے تو نہیں بھیجا تھا۔

''مگر کیوں؟'' فاطمہ کے منہ سے مری، مری آواز نکلی۔

''تم سے حمنہ کا وجود برداشت نہیں ہوتا تھا۔ خود پر جبر کرتی تھیں۔ میں نے تمہیں اس مشکل سے آزاد کر دیا۔'' ماہر کے جواب نے اسے سرتاپا ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''یہ تو سراسر الزام ہے۔ میں نے کب حمنہ کو جبراً برداشت کیا؟ میری اس بچی کے ساتھ کیا دشمنی......'' فاطمہ کو جیسے رونا ہی آ گیا۔ دل کو آناً فاناً کچھ ہو رہا تھا۔ کیا ماہر نے فاطمہ کی وجہ سے حمنہ کو بورڈنگ بھیجا......؟ اسے گھر سے دور کیا؟ اپنی محبت سے دور کیا؟ فاطمہ کو خود سے نفرت سی ہوئی۔

''حورعین سے تو تھی ناں......؟'' ماہر جتلا کر بولا۔

''وہ اور بات تھی۔'' وہ جزبز ہو کر رہ گئی...... ''تم نے حمنہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ پلیز اسے واپس بلوا لو......'' فاطمہ التجائیہ بولی تھی۔

''میں نہیں چاہتا تھا حمنہ کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو۔'' ماہر کچھ اور سنجیدہ ہو گیا۔

''حمنہ تو اتنی اچھی بچی تھی، اس کی وجہ سے گھر کا ماحول کیوں خراب ہوتا۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ پلیز، حمنہ کو واپس بلوالو......'' فاطمہ سر تھام کر صوفے پر گر گئی تھی۔

''تم اپنے دل کو سنبھالو...... اس عمر میں دل کو کچھ ہو تو سیدھا اسپتال جانا پڑتا ہے۔'' وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ مذاق کر رہا تھا۔ فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اتنا کٹھور تھا کہ آج بھی فاطمہ کے دل کی کیفیت نہیں سمجھ سکتا تھا۔

فاطمہ بھل بھل رونے لگی۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا وہ اپنا غصہ یا انتقام معصوم حمنہ پر نکالتی...... گو کہ حورعین نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی...... اس کا گھر اجاڑا تھا...... دل ویران کیا تھا...... پھر بھی وہ حورعین کے گناہوں کا بدلہ حمنہ سے لینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

بہت دیر رونے کے بعد اسے خیال آیا تھا کہ امر کی ملازمہ حمنہ کو لے کر گئی ہے۔ ماہر کہہ رہا تھا۔ حمنہ کو بورڈنگ بھیج دیا ہے...... بات کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔

''حمنہ کو آمنہ کیوں لے گئی؟'' اس نے اتنی دیر بعد پہلا عقل مندانہ سوال کیا تھا...... ماہر جاتے، جاتے رک سا گیا۔

''مجھے ضروری کام تھا...... اسی لیے آمنہ کو بلوایا......'' اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

''اور اب تم صدمے کی کیفیت سے نکل آؤ...... حمنہ جہاں گئی ہے وہاں بہت خوش رہے گی۔ اس گھر میں وہ بہت بور ہوتی تھی۔''

''حورعین کی روح تڑپتی ہوگی۔'' بلا ارادہ ہی فاطمہ کے منہ سے پھسل گیا...... ماہر کو پھر سے رکنا پڑا...... پھر وہ سمجھانے والے انداز میں بولا تھا۔

''تم حورعین کی روح کے لیے غمزدہ نہ ہو...... اچھے لوگوں کی روحوں کو کوئی غم نہیں ہوتا۔'' اس کا انداز صاف جتانے والا تھا۔ فاطمہ روتے، روتے چونک گئی تھی۔

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں بہت بری ہوں......'' اس کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

''میں نے یہ کب کہا......؟'' وہ فوراً معصوم بن گیا...... شاید سمجھ گیا تھا کہ فاطمہ انتہائی جذباتی ہو جائے گی تو پھر...... ''حمنہ کو واپس لے آؤ۔'' اس کی تان وہیں ٹوٹ رہی تھی۔ ماہر نے گہری سانس کھینچ کر کہا۔

''تم اتنا گلٹی فیل مت کرو...... حمنہ کچھ دنوں کے لیے آئی تھی۔ وہ اپنے گھر گئی ہے، کسی بورڈنگ نہیں۔'' اسے فاطمہ کی حالت پر ترس آگیا تھا۔ فاطمہ جیسے پھر سے ہونق بن گئی تھی۔ اس کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ وہ ہکا بکا ماہر کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

''میں سمجھی نہیں......'' اس نے بہ مشکل زبان ہلائی تھی ورنہ اس کی حالت انتہائی متزلزل تھی......

''جلدی سمجھ جاؤ گی......'' ماہر نے مبہم سا جواب دیا پھر مسکراتا ہوا اوپر چلا گیا۔

''عون اور محمد کا ناشتا بنا دو...... ان کی اسکول بس آنے والی ہے۔'' بیڈروم میں پہنچ کر اس نے آواز لگائی تھی جبکہ فاطمہ پھر سے سر تھام کر بیٹھ گئی...... اس کا دماغ بالکل سن ہو گیا تھا۔

آخر یہ ماہر اس کے ساتھ کون سی گیم کھیل رہا تھا؟

☆☆☆

ٹی وی پر بش گارڈن کی ڈاکومنٹری چل رہی تھی۔ مامی، عون اور محمد تینوں انتہائی دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ فاطمہ بھی آتے جاتے ٹی وی اسکرین پر نگاہ ڈال لیتی تھی۔

تین سو ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی یہ شاندار اور دلچسپ تفریح گاہ تھی۔ بڑے گیٹ سے داخل ہوتے ہی مراکش شہر کا نظارہ دکھتا تھا۔

مراکش کی موسیقی بھی سنائی دیتی تھی۔ بش گارڈن میں مختلف افریقی ممالک کی تہذیب وتمدن کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ مصنوعی سیٹ لگائے گئے تھے۔

فاطمہ بھی دلچسپی سے رک کر دیکھنے لگی۔

مراکو، نیروبی، کانگو اور ٹمبکٹو کی تہذیب دکھائی گئی تھی۔ افریقی مکانات، لباس، ڈانس، موسیقی اور جانور وغیرہ دکھائے جارہے تھے۔

افریقہ کے جنگل کا مشہور کردار ٹارزن اور بہت سے ایڈونچرز، کشتی کا خطرناک سفر، ڈولفن مچھلی کے کرتب، برڈ شو میں طوطے کے شاندار کرتب......

چمپینزی جانور نے چائے تیار کر کے دکھائی تھی۔ ڈھول بجایا تھا اور انسانی حرکات سے محظوظ کیا تھا۔ بیلے ڈانس، کوبرا ڈانس اور جانے کیا کیا۔

بچے سانس روک کر ٹی وی اسکرین دیکھ رہے تھے۔ یہی حال مامی کا بھی تھا۔ وہ بھی یک ٹک اسکرین کی طرف متوجہ تھیں۔

فاطمہ اس فسوں خیز ڈاکومنٹری سے نگاہ چرا کر کچن کی طرف جارہی تھی۔ جب اچانک ڈور بیل کی آواز آئی۔ اس نے کچن کی طرف جانے کا ارادہ بدل دیا کیونکہ مامی یا عون، محمد ہرگز نہیں ٹی وی کے سامنے سے اٹھنے والے تھے۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا۔ فاطمہ نے دو تین مرتبہ انہیں ہوم ورک کے لیے فورس کیا تھا مگر وہ بالکل بھی اس کی بات نہیں سن رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اسکرین سے چپکی ہوئی تھیں۔

فاطمہ نے سر جھٹک کر جیسے ہی انٹرنس ڈور کھولا...... اس پر حیرتوں کے آسمان ٹوٹ پڑے تھے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ اس کے سر پر پہاڑ آن گرا تھا۔

فاطمہ کو اس لمحے پتا چلا تھا کہ پیروں تلے سے زمین نکلنا کسے کہتے ہیں؟ سر پر آسمان کا گرنا کیا ہوتا ہے؟ قیامت کا ٹوٹ پڑنا کیا ہوتا ہے؟ اس لمحے فاطمہ کو پتا چلا تھا کہ زمین کا گول ہونا کیا ہوتا ہے؟ قبروں سے مردوں کا اٹھنا کیا ہوتا ہے؟ فاطمہ کو لگا اس کا دل بند ہو جائے گا، دھڑکنا بھول جائے گا...... رک، رک کر چلنا چھوڑ دے گا۔ وہ اس کے سامنے مجسم کھڑی تھی۔ وہی جو اس کی زندگی کا ناسور تھی، عذاب تھی...... وہی جو ایک مرتبہ پھر اس کی زندگی میں بھونچال لانے لوٹ آئی تھی۔

فاطمہ کو اتنی زور کا چکر آیا کہ وہ لہراتی ہوئی زمین پر جا گری۔

اس کے بچے جو ڈاکومنٹری میں گم تھے سانس تک نہیں لے رہے تھے، آنے والی شخصیت کو دیکھ کر اٹھے اور چلاتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

جبکہ فاطمہ بے ہوش ہونے سے پہلے کسی کو اپنے اوپر جھکتا اور ایمبولینس کو فون کرتا سن چکی تھی۔ پھر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہوگئی تھی۔

☆☆☆

ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔ ہر منظر دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ کوئی بھی عکس واضح نہیں تھا۔ کوئی بھی منظر واضح نہیں تھا۔ ایک لمبی اور طویل سڑک تھی...... بہت لمبی اور بہت سنسان...... جانے یہ نیویارک کی سڑک تھی یا فلوریڈا کی۔ اس نے بہت غور کیا...... ذہن پر بہت زور دیا...... مگر اسے دھند کے پار کوئی منظر صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ پتا چل رہا تھا کہ یہ سڑک کون سی ہے؟

وہ اندھا دھند بھاگتی جارہی تھی۔ بھاگتی جارہی تھی...... کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا پھر اچانک اسے کسی نے بتایا۔

یہ ریاست فلوریڈا تھی...... اس کا آبائی شہر، وہ فلوریڈا میں پیدا ہوئی تھی...... اس نے ملائکہ نامی مسلمان عورت کے بطن سے جنم لیا تھا...... اس کا باپ نسلی یہودی انگریز تھا۔ بہت بچپن میں اس نے ممی کی زبانی سنا تھا...... اس کا باپ شادی کے وقت ڈھکوسلے کے طور پر مسلمان ہوا تھا۔ اندر سے وہ کٹر یہودی تھا۔ اس نے ممی کو دھوکا دیا تھا۔ ممی سے شادی کے لیے مسلمان ہونے کا ڈھونگ رچایا تھا۔ وہ مسلمان نہیں تھا۔ وہ مسلمان ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اندر باہر سے یہودی تھا...... انتہائی بے رحم، کینہ پرور اور خبیث صفت...... اس کی ممی نے پاپا کے ہمراہ بہت گندی زندگی گزاری تھی۔

بظاہر پاپا مسلمان تھے۔ ممی کو دکھانے کے لیے

نماز بھی پڑھتے یا پھر جانماز بچھا کر کھڑے ہو جاتے۔

بہت بچپن میں اس نے بہت دھندلے سے یہ منظر بھی دیکھے تھے۔

ممی اور پاپا کے درمیان بڑے سرد اور برفیلے تعلقات تھے...... وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ پھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔

جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو آس پڑوس کے لوگوں نے اسے بتایا۔

''ملائکہ نے اپنے ماں، باپ کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ یہ دونوں یونیورسٹی فیلو تھے، آج تک ملائکہ اس بھول کی سزا کاٹ رہی ہے۔''

ایسے ہی بے شمار واقعات اور کہانیاں اسے سنائی جاتی رہی تھیں۔ جب تک نانی زندہ رہیں...... وہ باقاعدگی سے آتی تھیں۔ ممی کو راشن کے لیے پیسے بھی دیتیں، کپڑے، جوتے بھی لاتیں، پھل، فروٹ بھی مل جاتا تھا۔ فاطمہ کچھ اور بڑی ہوئی تو اسے مزید پتا چلا کہ اس کے نانا چار نسلوں سے امریکا میں مقیم تھے۔ ان کا بڑا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ نانا نے اپنے دو بچوں کی شادیاں پاکستان سے کی تھیں۔

اس کی مامی پاکستان سے بیاہ کر نیویارک آئی تھیں اور خالہ بیاہ کر پاکستان چلی گئیں۔ نانا کی خواہش تھی ممی کی شادی بھی پاکستان میں ہوتا کہ ان کا بھی فیوچر محفوظ ہو جائے لیکن ممی نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے پاپا سے کورٹ میرج کر لی یا پھر ممی کے نصیب میں ذلت بھری زندگی لکھی تھی۔ جو پاپا کے توسط سے ہی انہیں ملنی تھی۔

ممی کے اس انتہائی اقدام پر نانا ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ دوبارہ اٹھ ہی نہیں سکے۔ نانا کے بعد نانی نے ہمیشہ ممی کی خبر گیری کی تھی۔

جب بھی نانی، ممی کے پاس آتیں...... وہ روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کے فاطمہ کے بارے میں سوال کرتیں...... وہ فاطمہ کے لیے بہت پریشان تھیں...... اور اسے محفوظ ہاتھوں میں دینا چاہتی تھیں۔ ممی کی ہر التجا کے بدلے نانی کا ایک ہی جواب ہوتا۔

''اس کا تو نکاح ہو چکا ہے گو کہ بچپن کا.... نکاح ہے، رجسٹرڈ نہیں ہے پھر بھی نکاح تو بہر حال ہے ناں....'' نانی بہت پریشانی سے ممی کو بتاتی تھیں...... وہ کچھ سمجھدار ہوئی تو اسے پتا چلا...... نانی کس کے نکاح کی بات کرتی تھیں۔

فاطمہ نے ہمیشہ اپنی ممی کو روتے دیکھا...... یا پاپا کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے محبت کے بدلے میں ذلت خرید لی تھی۔ کیسا گھاٹے کا سودا کیا تھا انہوں نے بھرپور خسارہ...... نانی، ممی کے حالات پر بہت غمزدہ رہتی تھیں۔

پھر انہوں نے اس کا ایک حل نکال ہی لیا۔ وہ فاطمہ کو اپنے ساتھ نیویارک لانے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ مگر ممی نے اس فیصلے میں کچھ ترمیم کروائی تھی۔ ممی نے اپنی خواہش کا برملا اظہار کر دیا تھا۔

''آپ فاطمہ کو نکاح کے بعد لے جائیں۔'' ممی کے انداز میں واضح جھجک تھی۔ نانی کچھ ٹھٹک گئیں۔

''کس کے ساتھ نکاح......؟'' نانی کی آنکھوں میں خدشات اتر آئے تھے۔

''ماہر کے ساتھ۔'' ممی نے سر جھکا کر کہہ دیا۔

''مگر ماہر کا تو بچپن میں ہی نکاح ہو چکا ہے.... سدرہ (مامی) کی بھتیجی سے۔'' نانی نے واضح طور پر مامی کی بھتیجی کہا تھا...... اپنی نواسی نہیں...... کیونکہ وہ ممی کو احساس دلانا چاہتی تھیں کہ وہ رشتہ کس قدر نازک اور حساس ہے...... مامی اور خالہ کی کراس میرج (وٹے سٹے کی شادی) تھی۔ خالہ بیاہ کر پاکستان گئی تھیں اور مامی بیاہ کر نیویارک آئیں...... اس طرح خالہ اور مامی کی دُہری رشتے داری تھی۔

ماہر کی منکوحہ نانی کی سگی نواسی تھی جیسے فاطمہ ان کی نواسی تھی۔ پھر بھی نانی کا جھکاؤ فاطمہ کی طرف ہی تھا۔ کچھ ممی کے آنسوؤں نے نانی کو زیر کر دیا تھا۔

ممی کا بڑھتا دباؤ...... تکلیف دہ زندگی پھر کینسر جیسی بیماری، ذلت بھری زندگی...... یہ سارے پوائنٹس

ملا کر فاطمہ کا فیوچر بے انتہا بھیانک دکھائی دیتا تھا۔

نانی کا آہستہ، آہستہ ہی سہی دل پسیجنے لگا...... پھر انہوں نے دل کو مضبوط کر کے دلائل سے قائل کر لیا...... لیکن وہ ممی کو خود غرض کہنے سے باز نہیں آتی تھیں۔

''فاطمہ کا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی تمہاری بات نہیں مانتی...... تم شروع سے ہی خود غرض ہو......'' نانی دل سے خوش نہیں تھیں مگر انہوں نے اپنی بارعب شخصیت اور ماموں کی فرمانبرداری کا فائدہ اٹھا لیا تھا۔

نانی نے جیسے تیسے بالآخر ماموں اور مامی کو منا لیا۔

اس بات پر کتنا ہنگامہ ہوا...... مامی نے گھر چھوڑ دینے کی دھمکیاں تک دیں...... ماہر نے لاکھ سر پٹخا...... ہزار دفعہ انکار کیا...... مگر اس کی ایک نہیں سنی گئی۔

وہ آزاد معاشرے کا فرد ہو کر بھی مجبور ہو گیا...... اسے رشتوں، ناتوں کی کڑیاں پہنا دی گئی تھیں اور اسے اتنا مجبور کر دیا گیا کہ وہ شادی کرنے فلوریڈا پہنچ گیا۔

فاطمہ نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ماموں زاد کو دیکھا تھا...... وہ اپنے تاثرات سے بہت اکھڑ لگ رہا تھا۔ یہ زبردستی کی شادی تھی۔ وہ خوش نہیں تھا۔ وہ سخت برہم تھا...... اور غصے میں خود کو گالیاں دیتا وہ بالکل فاطمہ کو اپنے باپ کی طرح لگا تھا۔

فاطمہ کو کچھ ہی عرصے میں اندازہ ہو گیا تھا کہ ماہر اس کے باپ جیسا نہیں مگر اس کے باپ سے کم نہیں تھا۔ وہ انتہائی غصیلہ، بدمزاج اور جھگڑالو تھا...... یا پھر فاطمہ سے شادی کے بعد وہ اتنا بدمزاج ہو گیا تھا۔ اسے فاطمہ کے ہر کام میں کیڑے نظر آتے۔ اسے فاطمہ کی شکل بری لگتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت اجڈ اور جاہل کہتا۔

وہ فاطمہ کو سخت ناپسند کرتا تھا...... اسی طرح مامی کا رویہ بھی اس کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز تھا۔ وہ بار، بار جتاتی رہتیں۔

''تم حورعین جیسی نہیں...... تم اس جیسی بن بھی نہیں سکتیں۔ تم حورعین کی جوتی جیسی بھی نہیں......'' اس نے حورعین کا نام اتنی مرتبہ اس گھر میں سنا تھا کہ اسے حورعین کے نام سے نفرت ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ اس کی سگی رشتے دار تھی۔

کسی کو اس کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں تھا۔ ماہر کا جب دل چاہتا، میز الٹ دیتا تھا۔ یہاں حورعین کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ یہاں کسی فاطمہ کا سکہ نہیں چل سکتا تھا۔ پھر ایک مدت کے بعد اس نے حورعین کو بالآخر دیکھ ہی لیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ عون اور محمد کو گود میں اٹھا کر اسپتال سے گھر آئی تھی گو کہ اس نے ماہر کی زندگی میں معمولی سی جگہ پا لی تھی۔ وہ اس کے بیٹوں کی ماں بن گئی تھی تاہم ماہر کے دل میں آج بھی حورعین بستی تھی...... وہ اس کے عشق میں گرفتار تھا۔

مامی نے خود کئی مرتبہ فاطمہ کو بتایا تھا۔

''ماہر ہر سال حورعین کی سالگرہ پر پاکستان جاتا ہے۔'' مامی کسی حد تک فخریہ بتایا کرتی تھیں یا پھر اسے جلانے کی کوشش کرتی تھیں۔ فاطمہ کو اس وقت یقین ہو گیا تھا جب واقعی شادی کے دوسرے سال بھی اچانک ماہر پاکستان چلا گیا...... اس دفعہ ماہر کا جانا ایک نئی قیامت کو اٹھا لایا تھا...... اس دفعہ حورعین، ماہر کے ساتھ آئی تھی...... وہ ہائر اسٹڈیز کے لیے آئی تھی۔

وہ امریکا میں پڑھنے کے لیے آئی تھی مگر ماہر جانتا تھا اور فاطمہ بھی جانتی تھی کہ حورعین کس مقصد کے لیے آئی ہے۔ حورعین کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے فاطمہ کو بھی محسوس ہوا تھا کہ ماہر اگر اس کے عشق میں گرفتار ہے تو ٹھیک ہی گرفتار ہے۔

حورعین ایسی تھی کہ اسے چاہا جاتا...... حورعین ایسی تھی کہ اس سے محبت کی جاتی...... وہ سرتاپا عشق تھی۔ حورعین کے آتے ہی فاطمہ کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ ماہر کی مصروفیات حورعین سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی تھیں۔ اسے یاد رہتا تو بس حورعین کو وقت دینا...... اسے تفریح کرانا...... اسے گھمانا، پھرانا اسے ہر حال میں خوش رکھنا...... فاطمہ کے دل میں ان دنوں ایک عجیب سی لہر اٹھا کرتی تھی بہت عرصے تک فاطمہ اس لہر کو کوئی نام دینے سے قاصر رہی تھی...... پھر بہت عرصے بعد فاطمہ کو اس لہر کی موجوں اور اتار چڑھاؤ

کی سمجھ آگئی تھی۔ آخر یہ لہر تھی کیا......؟ عون اور محمد جب تین سال کے ہوئے تو فاطمہ کو پتا چلا...... وہ حورعین سے حسد کی آگ میں جل رہی تھی۔

☆☆☆

اس لہر کا نام حسد تھا۔ حسد کی آگ جو مسلسل جلاتی ہے جلا جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

فاطمہ بھی حسد کی اس آگ میں جل رہی تھی...... یہ آگ بڑھتی چلی جاتی تھی، کم نہیں ہوتی تھی۔ اس آگ کو بڑھنا ہی تھا...... جلانا تھا اور جلا کر راکھ کر دینا تھا پھر جب ممی کی ڈیتھ ہوگئی تو وہ مزید تنہا ہوگئی......نانی بھی چلی گئیں تب اکیلے پن کی ڈسی فاطمہ نے ماہر کے اکلوتے دوست امر کا سہارا لے لیا۔

وہ امر تھا...... ماہر کا جگری دوست...... جس کا بسیرا اسی گھر میں تھا...... وہ ماہر کے ساتھ رہتا تھا اور وہ حورعین کے آس پاس بھی رہتا تھا۔

ایسے ہی وقت گزرتا گیا...... فاطمہ پر ایک، ایک دن بھاری تھا...... پُر اذیت تھا۔ وہ کانٹوں پر سفر کرتی تھی۔ جانے کیسے امر کو اس کے دل کی حالت اور اذیتوں کا پتا چل گیا...... شاید وہ خود چلتی پھرتی غم کی تصویر تھی۔

فاطمہ نے ذرا سی ہمدردی پا کر اپنا دل کھول کر دکھا دیا...... امر گو کہ بہت مخلص تھا، ہمدرد تھا پھر بھی وہ ماہر کو براہِ راست ٹوک نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے احساس نہیں دلا سکتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے حال پر نظرِ کرم کرے۔

وہ ہمیشہ فاطمہ کو سمجھاتا کہ وہ خود بااعتماد ہو...... بہادر بنے اور اسٹینڈ لے...... اپنے حق کے لیے آواز اٹھائے...... ماہر کو بہادر اور بااعتماد لڑکیاں پسند تھیں۔

امر اسے سمجھاتا تھا کہ وہ خود میں تبدیلی لائے...... اپنی قابلیت اور ذہانت سے ماہر کا دل جیتے اور اسے اپنی طرف متوجہ کرے۔

اور فاطمہ کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ ساری خوبیاں اس کے اندر کیسے جمع ہو سکتی تھیں۔ وہ بس اپنا اور حورعین کا موازنہ کیا کرتی۔

اور حورعین کا پلڑا ہر لحاظ سے بھاری دکھائی دیتا...... وہ فاطمہ کی سگی خالہ زاد تھی...... مگر وہ فاطمہ سے بہت مختلف تھی۔ وہ حورعین تھی...... حوروں سی بہت شاندار، مکمل اور سحر طاری کر دینے والی شخصیت کی مالک اس کا سحر سر چڑھ کر بولتا تھا۔ یوں کے سدھ بدھ ہی بھلا ڈالتا۔

ماہر کے اس سے کس نوعیت کے تعلقات تھے یہ تو فاطمہ کو پتا نہیں تھا مگر وہ اس آزاد معاشرے کی شہری تھی۔ یہاں کی ہر گری ہوئی اخلاقی قدر کو جانتی تھی۔

اس کے اندر خدشے اور وسوسے پنپتے تھے...... شیطانی خیالات سر چڑھنے لگتے۔ وہ پہلے پہل تو ماہر سے بدگمان ہوئی پھر اس پر اور حورعین پر شک کرنے لگی۔ دراصل ان دنوں کچھ ہوا اس طرح سے تھا یا پھر ان دنوں اس کا نصیب ہی دائرے میں گردش کر رہا تھا اور وہ نحوست کا دائرہ تھا۔

وہ دن بھی شاید نحس تھے...... کاش کے فاطمہ کی زندگی میں آتے ہی نہیں...... مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے...... ان منحوس دنوں میں اس کا باپ فلوریڈا سے نیویارک آگیا تھا۔ اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ ممی کے بعد وہ سچ مچ بھکاری بن گیا تھا کیونکہ ممی تو بیماری کی حالت میں بھی کما کر لے آتی تھیں مگر اس کا باپ شراب کے نشے میں ممی کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے لٹا آتا تھا۔ ان دنوں فاطمہ کا ستارہ گردش میں تھا۔

ایک تو ماہر اور اس کی تکرار بہت ہونے لگی تھی۔ ماہر اگر غصے میں ایک برتن توڑتا، فاطمہ دس توڑنے سے گریز نہیں کرتی تھی۔

عون اور محمد کے بعد وہ کوئی پہلے سی دبو قسم کی فاطمہ نہیں رہی تھی۔ وہ ایک کی دس سناتی...... چیختی اور چلاتی تھی...... ماہر کو گالیاں تک دے لیتی اور مامی سے جھگڑا بھی کرتی تھی...... ماہر بھی جواباً کم نہیں تھا مگر اس نے فاطمہ کے باپ کی طرح کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔

ایک دن حورعین روز، روز کے ہنگاموں سے تنگ آ کر ہاسٹل چلی گئی تھی اور پھر حورعین کا ہاسٹل جانا قیامت ہوگیا۔

حورعین شاید کبھی بھی ہاسٹل جانے کا فیصلہ نہ کرتی لیکن اس صبح فاطمہ نے ماہر اور مامی کی غیر موجودگی میں حورعین کو اتنا ذلیل کیا...... اتنا خوار کیا...... اتنی باتیں سنائی کہ وہ دوسرے ہی لمحے یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

فاطمہ نے حورعین کے جیسے کان کھول دیے تھے۔

''کال گرلز اور طوائفوں کی یہاں کمی نہیں تھی جو تم ایک اور اٹھ کر آ گئی ہو...... تمہیں ماہر کے علاوہ کوئی گھاس نہیں ڈالتا...... کوئی منہ نہیں لگاتا...... یہاں سے دفعان ہو جاؤ...... میرا گھر مت اجاڑو...... مجھے بے گھر مت کرو...... دفع ہو جاؤ...... ورنہ میں تم پر تیزاب پھینک دوں گی۔'' وہ چلاتی رہی تھی۔ گالیاں دیتی رہی تھی۔ غصہ کرتی رہی تھی۔ آگ اگلتی رہی تھی اور پھر حورعین اس کی ایک، ایک بکواس کو خاموشی سے سن کر ہمیشہ کے لیے اپنے ماموں کا گھر چھوڑ گئی...... شاید فاطمہ کی بھنبوڑی ہوئی بار بار ٹھکرائی روح کو چین آجاتا۔ شاید حورعین کے چلے جانے کے بعد اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا، سکون آجاتا...... لیکن فاطمہ کی زندگی میں سکون کہیں نہیں تھا...... اس کا باپ بدقسمتی کا طوفان بن کر اچانک چلا آیا۔ وہ جو حورعین کے دفعان ہو جانے کے بعد بہت چین سے تھی۔ اس کا سارا چین و سکون غارت ہو گیا تھا۔

وہ کرسمس کی رات تھی۔ سارا نیو یارک بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر گام جگنوؤں کی طرح چمک رہا تھا لیکن فاطمہ کی زندگی میں اس رات تاریکیاں اتر آئی تھیں۔ اندھیرے بھر گئے تھے۔ سیاہی جم گئی تھی۔ کاش کہ وہ رات آتی ہی نہیں...... یا اس کی زندگی کے صفحے سے وہ رات ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی۔

☆☆☆

فاطمہ بچوں کو سلا کر نیچے آئی تو ماہر کرسمس کی رونقیں دیکھنے چلا گیا تھا۔ اس رات مامی بھی نہیں تھیں۔ فاطمہ اکیلی تھی لیکن یہ اکیلا پن کچھ ہی دیر میں ختم ہو گیا تھا۔ اس رات بہت عرصے بعد اس کا باپ ملنے چلا آیا تھا۔ فاطمہ بہت عرصے بعد اپنے باپ کو دیکھ کر جذبات پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ وہ اپنے خساروں پر ایسا روئی کہ روتی ہی چلی گئی تھی۔

جانے کون، کون سے دکھ یاد آ گئے تھے۔ جانے کون، کون سی محرومیاں یاد آ گئی تھیں۔

اس کا باپ بھی بڑا خود کو ہمدرد اور محبت کرنے والا باپ ثابت کر رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک فاطمہ کے پاس بیٹھا رہا...... پھر وہ ماہر کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اچانک اس کے باپ نے اپنا موبائل نکالا اور کچھ تصویریں دکھائیں۔ یہ کسی ریسٹورنٹ کی تصویریں تھیں، کہیں پکنک پوائنٹ نظر آ رہے تھے، کہیں پارک اور کہیں بیچ کی تصویریں تھیں ہر جگہ ماہر اور حورعین ساتھ، ساتھ تھے۔

ان کی قربت بتاتی تھی کہ ان کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے...... فاطمہ جیسے سرتاپا ہل کر رہ گئی تھی۔

اس کے علاوہ پاپا نے مزید بھی بہت کچھ بتایا تھا۔

''تم آنکھیں کھلی رکھو...... بہت جلد اس ڈریم لینڈ سے نکل جاؤ گی...... اپنے شوہر کو قابو کرو...... وہ اس لڑکی کے ساتھ آوارگیاں کرتا پھرتا ہے۔'' پاپا کے الفاظ اس کے اندر حسد اور شک کا ایک اور بیج بو گئے تھے۔ وہ جیسے سن ہو گئی تھی۔ پھر بات یہاں تک ہی محدود نہیں تھی۔ پاپا اس تک ایک، ایک بات کی رپورٹ پہنچاتے اسے ماہر اور حورعین کے بارے میں لمحہ بہ لمحہ باخبر کرتے...... اور فاطمہ جیسے جل، جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ فاطمہ اور ماہر کے تعلقات سرد ہو چکے تھے۔ گھر میں ایک جنگ اور دنگل کا ماحول تھا۔ ماہر سیر تھا تو فاطمہ سوا سیر...... دونوں میں لمبی تکراریں ہوتیں، جھگڑا بڑھتا، ماہر گالیاں دیتا...... اپنے اوپر لگائے الزامات کی تردید کرتا اور چلاتا ہوا گھر سے نکل جاتا۔

فاطمہ کو ان دنوں سمجھ نہیں آتی تھی وہ کیسے حورعین کو ماہر سے دور رکھے...... اپنا گھر بچائے، اپنی زندگی بچائے پھر امر سے دل کا حال کہا تو اس نے بڑا آسان

مشورہ دیا تھا۔

"حورعین اور ماہر کا آپس میں نکاح ہے...... اگر یہ مناسب طریقے سے ختم ہو تو بہتر ہے تمہارے لیے بھی اور حورعین کے لیے بھی......" فاطمہ اس کی بات پر لمحے بھر کے لیے چپ ہوگئی تھی پھر اس نے اسی پہلو پہ سوچنا شروع کردیا تھا۔ اس نے امر کی بات کا غلط مفہوم لیا...... اور اپنی سمجھ کے مطابق اس پر عمل کرنا شروع کردیا۔ ان دنوں پاپا بھی فاطمہ سے مسلسل رابطے میں تھے۔

یہاں پر فاطمہ نے اپنی زندگی کی ایک اور بڑی نادانی کرلی تھی۔ اس نے پاپا کو راز میں شریک کرلیا...... اور ماہر کے حورعین سے نکاح کی خبر دے ڈالی۔ پاپا کے لیے یہ شاکنگ نیوز تھی۔ وہ جہاں کے تہاں رہ گئے تھے پھر انہوں نے اسے تسلی دی اور اس معاملے کو اپنے تئیں خود ہینڈل کرنے کا فیصلہ کرلیا...... پاپا نے کیسا منصوبہ بنایا تھا اور کیا شاطرانہ چال چلی تھی۔ فاطمہ کو جلد پتا چل گیا تھا۔ فاطمہ نے بھی تمام اختیارات اپنے اس لالچی باپ کو سونپ دیے تھے جس نے ایک دن بھی اس کی ماں کو سکھ کی سانس لینے نہیں دی تھی۔ پہلے تو پاپا نے ماہر پر نظر رکھی...... اس کے پل، پل کی رپورٹ لی پھر ایک جامع منصوبہ بنالیا۔ فاطمہ اس منصوبے سے کچھ بے خبر تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ پاپا کیا کرنے والے تھے پھر وہ اسی بے خبری میں ایسی ماری گئی کہ عمر بھر خود سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہ سکی۔ فاطمہ کی زندگی میں وہ زلزلہ بھلا کس طرح سے آیا تھا...... جس نے اسے گھر سے بے گھر کردیا تھا بلکہ وطن سے بے وطن کردیا تھا۔

یہ ایک پری پلاننگ تھی...... گو کہ بہت خاص قسم کی نہیں تھی پھر بھی ان کی زندگیوں میں بھونچال ضرور لے آئی تھی۔ پاپا نے فیصلہ کیا...... کیسے ماہر اور حورعین کو دور کرنا ہے؟ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی۔ فاطمہ بھی مان گئی کیونکہ وہ بھی یہی چاہتی تھی۔ لیکن اس دوری کے پیچھے کیسی شاطرانہ چال ہوگی یہ فاطمہ کو نہیں پتا تھا۔

کرسمس نائٹ سے اگلے دن جب وہ لوگ فلوریڈا (سنگتروں کے ملک) روانہ ہوئے اور مالٹوں کے باغات میں بنے ریسٹورنٹ میں قیام کیا...... دراصل فاطمہ کو یہ بات بھی بعد میں پتا چلی تھی کہ ماہر نے حورعین کے لیے یہ پروگرام بنایا تھا کیونکہ حورعین کی ان دنوں چھٹیاں چل رہی تھیں۔ وہ رات حورعین کی اور فاطمہ کی زندگی میں آنے والی بھیانک ترین رات تھی۔

اس رات حورعین کو اغوا کرلیا گیا تھا...... اغوا کرنے والے کون لوگ تھے؟ وہ حورعین کو کہاں لے گئے تھے۔ انہوں نے حورعین کے ساتھ کیا، کیا تھا...... یہ سب کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک قیامت خیز واقعہ تھا۔ حورعین کو نشے کے انجکشنز لگائے گئے تھے اسے زیورات اور روپے پیسے سے لے کر ہر لحاظ سے لوٹا گیا تھا۔ علاوہ ازیں حورعین پر جسمانی اور جنسی تشدد بھی کیا گیا تھا۔ اس کا بازو فریکچر ہوگیا...... اس کا سر پھٹ گیا اور وہ موت وحیات کی کشمکش میں بے سروسامانی کی حالت میں فلوریڈا ہائی وے کے کنارے سے اٹھائی گئی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ ماہر اسے دیکھ کر پاگل ہوگیا تھا۔ حورعین کی شکستہ حالت کو دیکھ کر لاکھ عداوت کے باوجود بھی فاطمہ تک لرز اٹھی تھی۔ اس دوران امر اور ماہر کی انتھک کوششوں سے حورعین زندگی اور صحت کی طرف لوٹ آئی تھی مگر اس نے نہ جانے کتنی ہی مرتبہ خودکشی کی ناکام کوشش کرکے امر اور ماہر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں اس کی پٹی سے لگ گئے تھے۔

فاطمہ کے لیے یہ صورتِ حال بھی بہت اذیت ناک تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیسے اور کس طرح ماہر کو حورعین کی زندگی سے کھینچ لائے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ حورعین کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد ماہر گو کہ پہلے جیسا جھگڑالو نہیں رہا تھا پر وہ گھر میں کم، کم نظر آتا تھا۔ یقیناً وہ حورعین کے ساتھ ہی زیادہ رہتا تھا۔

☆☆☆

قریب دو ماہ بعد اچانک ماہر پر ایک ایسا جنون

سوار ہوا کہ اس نے فاطمہ کی ہستی کو بھنبوڑ کر رکھ دیا جانے ماہر پر کیسا جن سوار ہوگیا تھا یا اس کے دماغ کو کچھ ہوگیا تھا۔ اس پر وحشت سوار ہوگئی تھی۔ تب اس نے فاطمہ کے ساتھ بہت برا کیا۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ مارا، ذلیل کیا، کتوں کی طرح دھتکارا، گالیاں تک دیں، حتیٰ کہ طلاق تک دینی چاہی تھی۔ یہ امر تھا جو رحمت کا فرشتہ بن کر آگیا تھا اور اس نے فاطمہ کو ماہر کے عتاب سے اور جنون سے بچالیا تھا۔

ہاں تب ماہر ایسا ہی پاگل اور جنونی ہوگیا تھا۔ اس نے اسے نیویارک کی سڑکوں پر کتوں کی طرح گھسیٹا تھا، اسے خوار کیا تھا، ذلیل کیا تھا، رسوا کیا تھا...... بے جرم گھر سے نکالا اور اپنی زندگی سے نکالا...... حتیٰ کہ ملک سے بھی نکال دیا۔

فاطمہ تب کتنی تنہا اور اکیلی ہوگئی تھی۔ پورا شہر اس کے لیے اجنبی ہوگیا۔ سڑکوں پر دھکے کھاتی اور اپنا قصور اور جرم تلاش کرتی...... تب امر ہی تھا جو اس کا سہارا بنا...... وہ امر ہی تھا جو اسے زندگی کی طرف دوبارہ لایا...... لیکن فاطمہ کے اندر سے زندگی ختم ہوچکی تھی۔ اس کے اندر سے امنگ ختم ہوچکی تھی۔ امید ختم ہوچکی تھی۔ امر کے شورے پر وہ پاکستان اپنی خالہ کے پاس چلی آئی تھی۔ جو حورعین کی ماں تھیں۔ جنہیں فاطمہ نے اپنے اوپر بیتی ایک، ایک اذیت ناک پُردرد کیفیت کا بتایا تھا۔ درد ناک داستان سنائی تھی۔ دل پھاڑ دینے والے لمحوں کا احوال سنایا تھا۔

پھر کتنے سال ہی خالہ حورعین سے ناراض رہیں...... انہوں نے حورعین سے تمام تعلق توڑ لیے تھے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

پھر کئی سال گزر گئے تھے۔ اس دوران امریکا سے ماموں، مامی کے کئی فون آئے...... ماموں اسے لینے بھی آئے، ماہر سے صلح کی ہر ممکن کوشش میں لگے رہے۔

پھر ایک دن امر کی کال بھی آئی تھی...... اس نے خالہ سے کہا تھا۔

”حورعین اپنی نئی زندگی کی شروعات کرنے لگی

ہے۔'' امریکا اس کال کے بعد خالہ گم صم ہوگئی تھیں۔ وہ حورعین کو یاد کر کے رات، رات بھر روتی تھیں۔

ماموں اور مامی فاطمہ کو منانے کی ہر ممکن کوشش کے بعد خاموش ہو گئے تھے۔ پھر کئی سال بیتتے چلے گئے۔ فاطمہ نے اپنا دل پتھر کرلیا تھا۔ وہ واپسی کے ہر رستے کو بھول گئی تھی۔ واپس جاتی بھی تو کیوں......؟ اور کس لیے......؟ حورعین اور ماہر شادی کر چکے تھے۔ وہ اپنی زندگی سکون سے گزار رہے تھے۔ فاطمہ کیوں وہاں جاتی؟ محض کڑھنے کے لیے؟ جلنے اور حسد کرنے کے لے......؟ پھر وقت کچھ اور آگے بڑھا، خالہ دو ماہ کے لیے کہیں چلی گئی تھیں وہ اور پرانی ملازمہ اسی گھر میں تھے۔ ان دنوں وہ بیمار بھی تھیں۔ فاطمہ کو تو پتا نہیں چلا سکا تھا۔ وہ دراصل حورعین سے ملنے جاتی تھیں۔ تو کیا خالہ نے حورعین کو معاف کر دیا تھا؟ فاطمہ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا حورعین کی وجہ سے ہوا تھا۔ فاطمہ اسے کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ جان سے پیاری خالہ کی بیماری بڑھ گئی۔ وہ فاطمہ کو سمجھاتی تھیں۔ ہر وہ بات جو فاطمہ سمجھنے والی نہیں تھی۔ خالہ کی انتھک کوششوں کے بعد بالآخر فاطمہ کا دل کچھ نرم پڑا۔ اسے زمانے کے اتار چڑھاؤ کی سمجھ آگئی تھی پھر یہ کہ اگر خالہ کو کچھ ہو جاتا تو وہ کہاں جاتی......؟ سو ایک مرتبہ پھر اس نے دل پر پتھر رکھ کر واپسی کا سفر طے کرنا شروع کیا تھا......اس دوران خالہ بھی چلی گئیں۔ فاطمہ کے پاپا بھی مر کھپ چکے تھے۔ اب اس کا کوئی اور رشتہ تو رہا نہیں تھا......بس ایک اولاد کا تعلق تھا۔ دنیا میں اس کا واحد رشتہ اور سہارا......ممتا کی ہڑک نے جب اسے پاگل کر دیا تو وہ واپس نیویارک چلی آئی تھی کیونکہ اسے نیویارک آنا ہی تھا۔

☆☆☆

نیویارک پہنچ کر اس نے بہت ساری چیزوں میں تبدیلی دیکھی تھی۔ ماہر بھی بدل گیا تھا، وہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ مامی بھی ویسی نہیں تھیں۔

حالات اب واقعی وہ نہیں تھے جو فاطمہ سوچ کر آئی تھی۔ یہاں پر تیزی سے تبدیلی کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ ماہر کے مزاج میں بھی ٹھہراؤ آچکا تھا۔ وہ بدل گیا تھا یا پھر اسے وقت نے بدل دیا تھا۔ اس کا فاطمہ کے ساتھ پہلے جیسے رویہ نہیں تھا۔ اور واقعی ماہر بدل گیا تھا۔

لیکن ایک پھانس تو تھی ناں جو فاطمہ کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی تھی۔ ایک حرفِ معذرت بھی نہیں...... اپنے کیے پر ذرا سی شرمساری بھی نہیں...... الٹا وہ چاہتا تھا فاطمہ خود معذرت میں پہل کرے......پھر حمنہ کا وجود تھا جو نہ چاہتے ہوئے بھی فاطمہ کو کھٹکتا تھا۔ جانے ماہر کو کیسے خبر ہوگئی تھی۔ وہ حمنہ کو بورڈنگ چھوڑ آیا۔ حمنہ کے چلے جانے پر پہلی مرتبہ فاطمہ کو شرمندگی اور ندامت ہوئی تھی۔ وہ ایک معصوم اور بن ماں کی بچی کے ساتھ عداوت نہیں رکھ سکتی تھی۔

لیکن وہ بچی بن ماں کی کہاں تھی......؟ اس انکشاف نے تو فاطمہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا......اس انکشاف نے تو فاطمہ کو اسپتال کے بستر پر پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

فاطمہ نے بش گارڈن کی ڈاکومنٹری دیکھتے ہوئے جیسے ہی ڈور بیل کی آواز سنی تو دروازے پر دھیان گیا تھا۔ مامی اور بچوں سے تو امید نہیں تھی وہ اٹھ کر دروازہ کھولیں گے۔ فاطمہ کو خود ہی دروازہ کھولنا پڑا تھا اور جیسے ہی فاطمہ نے دروازہ کھولا سامنے کھڑی حورعین کو دیکھ کر اس کے سر پر آسمان آگرا تھا۔ وہ واقعی حورعین تھی، ویسی ہی حسین، دلکش، دلفریب......اُف فاطمہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ آنکھیں مسل مسل کر دیکھتی رہی۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ گول، گول گھوم رہا تھا۔ چکر کھا رہا تھا۔ پھر وہ لہرا کر زمین پر ایسی گری تھی کہ اسپتال جا کر ہی اس کی آنکھ کھلی۔

اور آج اسے اسپتال میں بھی دوسرا ہی دن تھا۔ اور دل چاہتا تھا کہ کبھی اس کی آنکھ کھلے ہی نہ آنکھیں بند ہی رہیں۔ پلکیں پپوٹوں سے جڑی ہی رہیں۔

بارِ ندامت نے اس کی آنکھوں کو جھکا کر اتنا شرمسار کر دیا تھا کہ وہ کبھی ماہر اور حورعین کے سامنے سر

اٹھا کر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کبھی حورعین کا سامنا نہیں کرسکتی تھی۔

وہ حورعین تھی جس کی ماں نے اسے پھولوں کی طرح رکھا تھا۔ جب ہر رشتے نے اسے دھتکار دیا تھا تو خالہ نے ہی اسے سینے سے لگایا، اس کا غم دور کیا، سہارا دیا، محبت دی، اعتماد بحال کیا...... اور حتیٰ کہ ماہر کے دل کو اتنے سال بعد فاطمہ کے لیے موم کردینے والی بھی خالہ ہی تھیں۔

بہت ساری ایسی حقیقتیں تھیں جن سے حورعین نے پردہ اٹھایا تھا۔ کاش کہ وہ پردہ پڑا ہی رہتا۔ فاطمہ کو کچھ پتا نہ چلتا، اپنا حسد، بغض، کینہ اور اپنے باپ کا دیا گیا گھاؤ اور گھناؤنا کردار کبھی دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن آج انکشافات کا دن تھا۔ فاطمہ کو آئینہ دکھانے کا دن تھا۔ حورعین آج بھی بلندی پر کھڑی تھی۔ فاطمہ آج بھی پستی میں دھنسی تھی۔

پھر اسپتال کی خاموش فضاؤں نے حورعین کا درد ناک نغمہ بھی سنا تھا۔ فاطمہ کا جھکا سر پھر کبھی اٹھ نہیں سکا تھا۔ وہ حورعین تھی جو بول رہی تھی اور یہ فاطمہ تھی جو سن رہی تھی۔

’’وقت انسان کو کبھی کبھار ایسے دوراہے پر لے آتا ہے جس سے نہ آگے رستہ نظر آتا ہے نہ پیچھے ہٹا جاسکتا ہے اور سمجھ بھی نہیں آتی کہ صحیح رستہ کون سا ہے......؟ انسان بھاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر بھاگ نہیں سکتا۔ چلتا ہے تو چل نہیں سکتا اور کبھی، کبھی وقت ہمیں بند گلی میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ایسی بند گلی جس کا کوئی روزن کوئی دریچہ نہیں ہوتا۔ وہاں سانس گھٹنے لگتی ہے۔ حبس بڑھنے لگتا ہے۔ جان نکلنے لگتی ہے اور روح چلانے لگتا ہے۔ میں بھی اس وقت ایک بند گلی میں کھڑی ہوئی تھی۔ جب مجھے خبر ملی کہ ملائکہ خالہ کی فاطمہ سے ماہر کی زبردستی شادی کروادی گئی ہے، کیا یہ خبر سچ تھی؟ یا کسی نے بھیانک مذاق کیا تھا؟ کیا کوئی اتنا بھیانک اور سفاک مذاق بھی کرسکتا ہے؟ مجھے لگا، میں نے کھڑے، کھڑے موت کا ذائقہ چکھ لیا ہے۔ کیا ماہر کی محبت مجھ سے جدا ہو چکی تھی...... کیا مجھ پر عمر بھر کے لیے وہ ماہر...... جس کی محبت میرے ساتھ سانس لیتی پروان چڑھی تھی، وہ محبت جو میری زندگی کو ایک، ایک قدم توانائی بخش کر آگے بڑھا رہی تھی۔ وہ محبت مجھ سے اچانک چھن گئی تھی۔ معلوم نہیں آخر کیوں...... میرے ساتھ ہی کیوں؟ کیا ملائکہ خالہ کو کوئی اور نہیں ملا تھا؟ کیا ماہر کے علاوہ پورے امریکا میں کوئی اور نہیں تھا؟ صرف ماہر ہی کیوں؟ اور یہ ماہر ایسا ہرجائی تھا جو ذرا بھی بغاوت نہ کرسکا؟ ان دنوں مجھ پر جنونی دورے سوار ہوگئے تھے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ مجھے دن کو چین نہیں ملتا تھا۔ میں رات بھر روتی تھی۔ دن بھر کمرے میں قید رہتی۔ ہاں تب مجھ سے میرا سکون چھن چکا تھا...... شاید میری یہ کیفیت برسوں تک قائم رہتی لیکن مجھے جلد ہی پتا چلا کہ جس خزاں کے دور سے میں گزر رہی ہوں۔ ماہر بھی اس پت جھڑ کے موسموں کا شکار ہے۔ میں بہت لمبی بات نہیں کروں گی فاطمہ...... میری ایک گھنٹے بعد واپسی کی فلائٹ ہے، مجھے چلے جانا ہے...... میں جاتے‘ جاتے تمہارے دل سے آخری پھانس نکال کر جاؤں گی۔‘‘ نہ جانے وہ کیا کہنے والی تھی۔

’’بھلے سے تم مجھے کچھ بھی نہ سمجھو...... لیکن میں تمہیں اپنی خالہ زاد کزن نہیں بہن سمجھتی اور مانتی ہوں۔ بہت مختصر لفظوں میں تمہیں اپنی زندگی کی حکایت بتاؤں گی جس طرح سانس اور روح کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہے۔ اسی طرح ماہر اور میری محبت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھی۔

’’شاید یہ بچپن کی محبت تھی۔ جب وہ ماموں کے ہمراہ میرے گھر آتا تھا یا پھر میں امی کے ساتھ یہاں چلی آتی۔ ملائکہ خالہ کے ساتھ ہمارے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے تھے۔ وجہ تو تم بھی جانتی ہو، اس کی گہرائی میں میں نہیں جاؤں گی۔ گو کہ ہم لوگ ملائکہ خالہ سے ملتے نہیں تھے مگر ان کے حالات سے بے خبر بھی نہیں تھے، میں نہیں چاہتی تم اپنے مرے ہوئے باپ

سے متنفر ہو مگر اس وقت جب تمہارا باپ تمہیں ایک مصری کے ہاتھوں بیچ رہا تھا اور تمہیں مصر اسمگل کر دیا جانا تھا تب خالہ نے ماموں کے پیر پکڑ کر منت کی تھی کہ تمہیں تمہارے باپ کی رذالت اور ظلم سے بچالیں۔ یہ ماموں ہی تھے جنہوں نے خالہ پر احسان کیا...... ماہر کو جیسے تیسے قسمیں دے کر منایا اور تم بیاہ کر محفوظ ہاتھوں میں چلی آئیں۔ میں کبھی اس عظیم بے وفائی پر ماہر کو معاف نہ کرتی...... مگر جب مجھے پتا چلا کہ فاطمہ کی زندگی اور عزت کا سودا کیا جارہا ہے، تب میں نے خود ماہر کو اپنی محبت اور نکاح کی زنجیر سے آزاد کر دیا تھا۔ گو کہ ماہر کو تمہارا ساتھ قبول کرنے میں بہت وقت درکار تھا پھر بھی میں جانتی تھی کہ تم دونوں کے درمیان جو فاصلے ہیں وہ کبھی نہ کبھی مٹ جائیں گے۔''

وہ یہ کیسا انکشاف کررہی تھی۔

''تم شاید سمجھتی تھیں کہ میں تمہیں جلانے اور تمہارا گھر اجاڑنے کے لیے نیویارک آئی تھی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ میں نے اسٹڈی کے لیے یہاں سے اپلائی کر رکھا تھا، ہاں ماہر نے کوششیں ضرور کی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ تم کو میرا آنا پسند نہیں آیا۔ تم مجھے ناپسند کرتی تھیں اور پھر اس کا واضح اظہار بھی کرنے لگی تھیں۔ مجھے باتیں بھی سنانے لگی تھیں پھر میں نے خود ہی یہاں سے چلے جانے کا سوچ لیا تھا حالانکہ میرے اس فیصلے پر ماہر مجھ سے کئی مہینے تک ناراض رہا تھا مگر میں ماہر کی زندگی کو بے سکون کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''ان ہی دنوں ماہر نے مجھے فورس کرنا شروع کیا کہ میں اپنی زندگی کے لیے کوئی مناسب فیصلہ کروں...... امر کا پروپوزل بھی موجود تھا اور ماہر مجبور بھی بہت کررہا تھا۔ میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ تمہاری زندگی سے بہت دور چلی جاؤں...... فلوریڈا ہم اسی وجہ سے گئے تھے، چھٹیوں کا تو بہانہ تھا۔

''وہاں فلوریڈا میں میرے ساتھ جو حادثہ پیش آیا تھا وہ اس قدر بھیانک اور ظالمانہ تھا کہ آج دس سال بعد بھی اذیت اور درد، خوف مجھے راتوں کو چلانے اور رونے پر مجبور کردیتا ہے۔ وہ دہشت وہ وحشت آج بھی میری روح کو جھنجھوڑ ڈالتی ہے۔ ایک طویل مدت لگی تھی مجھے اس عذاب اور خوف سے نجات حاصل کرنے میں...... اگر امر اور ماہر نہ ہوتے تو شاید میں مر جاتی، مٹ جاتی ختم ہوجاتی۔

''اپنی عزت، وقار اور ذات کے غرور کو کھودینے کا دکھ الگ تھا اور ماں کی بدگمانی کا غم الگ...... انہیں جو تم نے کہانی سنائی تھی وہ اسی پر ایمان لے آئی تھیں۔ ایک لمبا عرصہ وہ مجھ سے نفرت میں مبتلا رہی تھیں۔ پھر وقت نے مجھے ہر اس گناہ اور الزام سے بری کردیا تھا۔ امی کا دل صاف ہوگیا...... وہ مجھ سے راضی ہوگئیں...... اور اس سب میں امر اور ماہر کی انتھک کوششوں کا دخل تھا۔''

فاطمہ بت بنی اس کی داستان سنتی رہی۔

''فلوریڈا میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا...... تم تو سمجھتی ہوگی، بہت اچھا ہوا...... میں تمہارا گھر خراب کررہی تھی سو مجھے اسی بات کی سزا ملی...... یقیناً تب تم یہی سوچتی ہوگی ناں......؟'' حورعین لمحے بھر کے لیے رکی تھی۔ ایسے جیسے میلوں کی مسافت کے بعد کچھ دیر کے لیے سانس لینا چاہتی ہو اور فاطمہ کے دل کی دھڑکنیں جیسے تھم گئی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا حورعین کوئی نہ کوئی انکشاف کرنے والی تھی۔ ایسا کوئی انکشاف جو اس کی ہستی کو ہلا دیتا اور واقعی حورعین نے فاطمہ کے سر پر آسمان گرا ڈالا تھا۔ اس نے اسے آسمان سے پاتال میں لا پٹخا تھا۔ وہ حق دق رہ گئی...... جیسے منجمد ہوکر رہ گئی تھی۔

''جانتی ہو فلوریڈا میں مجھے کس نے اغوا کروایا تھا؟'' حورعین کی آواز غم اور صدمے کی شدت سے پھٹ پڑی تھی۔ فاطمہ کی آنکھوں میں سفیدی اتر آئی۔ اس کا دل رک، رک کر چلنے لگا تھا۔ اس کا دل دھڑکنا بھول رہا تھا۔

''میں شاید تمہیں کبھی نہ بتاتی۔ لیکن اس لیے بتارہی ہوں کہ جو دس سال تم نے کانٹوں پر چل کے گزارے ہیں یہ مت سمجھنا کہ ہم ان دس سالوں میں

بڑے خوشحال اور خوش و خرم رہے تھے۔ جو عذاب تم نے بھگتے ہیں وہ ہم نے بھی بھگتے تھے۔ جانتی ہو تمہارے باپ نے مجھے اغوا کروایا تھا۔ میری عزت کو پامال کیا...... مجھ سے میرا وقار اور زندگی چھین لی...... مجھے موت کے منہ میں پہنچا دیا...... میں اسپتال میں آخری سانسیں گن رہی تھی۔ شاید مجھے اپنے ناکام قاتل کا کبھی پتا نہیں چلتا، ماہر اور امر بھی بے خبر رہتے مگر تمہارے باپ نے خود آکر اس بات کا انکشاف کیا تھا۔ اس نے آکر کہا جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا وہ سب کچھ فاطمہ کے کہنے پر ہوا، یہ انکشاف ماہر کو پاگل کر گیا تھا۔ وہ تمہیں شاید قتل کر دیتا...... یا طلاق تو ضرور ہی دے دیتا۔ تمہاری قسمت اچھی تھی...... تمہیں امر نے بچالیا تھا یوں تمہیں پاکستان بھجوا دیا تھا ورنہ ماہر تمہیں قبر کے اندر سے بھی نکال کر سزا دے دیتا...... وہ تمہیں کبھی معاف نہ کرتا...... تمہیں دنیا میں ذلیل و خوار کر دیتا...... مگر ماموں کے بندھے ہاتھوں اور میری منتوں کی لاج اس نے رکھ لی تھی لیکن اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ عمر بھر تمہیں واپس نہیں لائے گا اور نہ کبھی تمہارے ساتھ تعلق بحال کرے گا...... وہ اپنی بات پر قائم تھا اور اسے قائم رہنا آتا تھا۔ پھر وقت گزرتا گیا۔ میرے رستے زخموں پر بھی کھرنڈ جمنے لگی تھی۔

''ماہر مجھے دل و جان سے اپنانا چاہتا تھا۔ اس نے زمین آسمان کا زور لگا ڈالا تھا۔ ہر طرح کی کوشش کی تھی مگر میں نے کبھی اسے مثبت جواب نہیں دیا۔ تنگ آکر اس نے مجھے امر کے ساتھ شادی کرنے پر فورس کرنا شروع کر دیا تھا۔ بس وہ مجھے آباد دیکھنا چاہتا تھا اور میں بھی اسے آباد دیکھنا چاہتی تھی۔

''جیسے تیسے صعوبتیں جھیل کر بالآخر ماہر نے مجھے امر کے ساتھ آباد کر ہی دیا تھا پھر میں کیسے ایسی ظالم، سنگ دل یا کٹھور ہوتی کہ ماہر کو سنسان اور ویران ہی رہنے دیتی۔ گو کہ کہ ماہر کو رام کرنے، سمجھانے اور تم تک واپس لانے میں دس سال لگے تھے لیکن بالآخر ایک دن ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے...... اس دوران امی بھی راضی ہو گئیں۔ انہیں بھی حقیقت کا پتا چل گیا تھا۔ امی نے بھی نیویارک آکر ماہر کو منایا...... اسے راضی کیا...... پرانی باتیں بھلا دینے پر مجبور کیا...... اور ماہر سے عہد لیا کہ ہم کبھی اپنے تکلیف دہ ماضی کو یاد نہیں کریں گے اور وہ تمہیں کبھی میرے حوالے سے طعنے نہیں دے گا، نہ اپنے انتقام کو تازہ کرے گا...... سو ماہر تم تک پچھلی ہر بات اور ہر حوالے کو بھلا کر آیا تھا۔

''پھر جلد یا بدیر ہر کوئی اپنے انجام کو پہنچ ہی جاتا ہے۔ برے کو اس کی برائی کا بدلہ ضرور ملتا ہے، تمہارے واپس آنے سے پہلے خود تمہارا باپ ماہر سے معافی مانگنے آیا تھا لیکن ماہر نے اسے دھتکار دیا۔ میں جانتی ہوں، اس سب میں تمہارا اتنا قصور نہیں ہوگا...... تم تو فطری حسد کا شکار تھیں مگر تمہارے خودغرض باپ نے تمہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔

''جب تم نیویارک پہنچیں تب تک میں پاکستان چلی گئی تھی امی کا آخری دیدار کرنے...... میرا قیام وہاں کچھ طویل ہو گیا تھا۔ حمنہ کو ماہر کے پاس چھوڑنا پڑا کیونکہ امر یا میرے بغیر تیسرا فرد ماہر ہے جس کے پاس حمنہ بخوشی رہ لیتی تھی۔ امر کو بزنس کے لیے بیرون ملک جانا تھا۔

''میں جانتی ہوں تمہیں حمنہ کی موجودگی میں تکلیف ہوئی ہوگی اور کچھ امر اور ماہر نے بھی تمہیں حقیقت نہیں بتائی ہوگی۔ وہ تمہیں جان بوجھ کر ستا رہے تھے۔''

وہ انکشاف کیے جا رہی تھی۔

''نہ تو میں دنیا سے گئی تھی اور نہ ہی حمنہ، ماہر کی اولاد ہے...... یہ میری اور امر کی اکلوتی، لاڈلی اولاد ہے...... جو کچھ امر نے منصوبہ سازی بنا کر تمہیں کلسایا ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں...... اس کے لیے تم امر اور ماہر کی کلاس لے سکتی ہو۔'' ایک لمبی اور طویل کہانی کے ہر کرب بھرے باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر کے حورعین نے آخر میں ذرا ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔ یوں کہ فاطمہ پتھر

کی صورت سے جاندار چیز میں ڈھل کر دھاڑیں مار، مار کر رونے لگی تھی۔ اس پر شرمندگی، ندامت اور اذیت کی کنکریاں برس رہی تھیں۔

یہ اس۔ نے حورعین کے ساتھ کیا کر ڈالا تھا...... اس کے باپ نے حورعین کے ساتھ کیا کر ڈالا تھا؟ فاطمہ ندامت اور شرمندگی کے اندھے کنویں میں جا گری تھی۔ وہ چیخ، چیخ کر رو رہی تھی۔ اسے حورعین کے اعلیٰ ظرف کے سامنے اپنا آپ انتہائی بونا اور چھوٹا لگ رہا تھا۔ وہ اتنی نیچ ہوگئی تھی۔ آخر اس نے حورعین کے ساتھ یہ کیسا ظلم کیا تھا؟ گو کہ وہ ایسی قصوروار نہیں تھی۔ اتنا سب کچھ کرنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو ہر بات سے بے خبر تھی لیکن جو دکھ حورعین کو ملے تھے وہ سب اسی کی وجہ سے ملے تھے۔ اس نے تو حورعین کو مفلس اور کنگال کر ڈالا تھا۔ اس کی عزت تک چھن گئی۔ اس کی ہر خوشی چھن گئی پھر بھی اللہ تعالیٰ نے حورعین کو مالا مال کر دیا تھا۔ اسے ہر اس چیز سے نوازا تھا جو حورعین سے چھن گئی تھی اور بے شک اللہ بڑا رحیم اور کارساز ہے۔ بے خطا کو ہرگز تنہا نہیں چھوڑتا۔

بارِ ندامت نے فاطمہ کو سراپا آنسو بنا دیا تھا۔ وہ حورعین کی ممنون تھی، اس کی احسان مند بھی تھی...... حورعین نے اس پر اتنے احسانات کیے تھے کہ وہ ایک بھی احسان اتار نہیں سکتی تھی۔

ہاں وہ حورعین سے معافی تو مانگ سکتی تھی ناں...... سو وہ ہاتھ جوڑے حورعین کے قدموں میں گر پڑی تھی۔ اسے عمر بھر حورعین کے سامنے جھکنا ہی تھا۔

''مجھے اپنی اس محبت کے بدلے میں معاف کر دو جو تمہیں ماہر سے تھی۔ اور مجھے اپنی اس زندگی کے بدلے معاف کر دو جو اللہ نے تمہیں تحفے میں دی۔'' حورعین نے اس کے پگھلتے آنسوؤں کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹا تھا اور اسے تمام درد، دکھ اور اذیتیں بھلا کر سینے سے لگا لیا...... کیونکہ حورعین کم ظرف نہیں تھی۔ اور جن کے ظرف بلند ہوتے ہیں وہ حورعین کی طرح ہی بلند ہوتے ہیں...... وہ پاتال میں گر کر بھی عروج پا لیتے ہیں۔ وہ زمین پر گر کر بھی آسمان کو پا لیتے ہیں۔

☆☆☆

زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا مقام ضرور آتا ہے جو انسان کو اپنی غلطیوں کا ادراک ہو جاتا ہے۔ فاطمہ کو اتنا وقت گزار کر اپنی ان غلطیوں کا پتا چل گیا تھا جو اس سے سرزد ہوئی تھیں گو کہ وقت بہت گزر چکا تھا لیکن ازالے کے لیے وہ مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی...... اب ازالے اور کفارے کا وقت تھا۔ خسارے اٹھا، اٹھا کر انعام پانے کا وقت تھا۔

ماہر نے ٹھیک کہا تھا...... اس نے اپنے باپ پر بھروسا کر کے غلط کیا تھا...... فاطمہ کو اپنے باپ پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جب وہ اس کی ماں کے ساتھ مخلص نہیں تھا تو بیٹی کے ساتھ کس طرح مخلص ہوتا؟ فاطمہ نے جو وقت بدگمانی، غصے اور اکڑ میں ضائع کر دیا تھا...... اب اس وقت کو واپس لوٹانا تھا۔ وہ حورعین سے معافی تو مانگ چکی تھی پھر اس نے ماہر سے بھی معافی مانگ لی تھی۔ ان دو لفظوں نے ماہر کے دل سے تمام میل اتار دیے تھے لیکن اس نے اتنا ضرور کہا تھا۔ اور یہ ''اتنا'' فاطمہ کی پوری زندگی پر بھاری تھا۔

''میں تمہیں اگر معاف نہ کرتا تو واپس بھی کبھی نہیں بلاتا...... اور اگر حورعین کی زندگی میں کوئی خوشی نہ آتی تو اللہ کی قسم نہ میں خوش رہتا اور نہ تمہیں خوشحال رہنے دیتا...... یہ سب کچھ جو تمہیں دوبارہ ملا ہے...... حورعین کی محبتوں، وسیع القلبی اور اعلیٰ ظرفی کے وسیلے سے ملا ہے۔'' ماہر کے ان الفاظ نے پھر کبھی فاطمہ کو حسد سے دوچار نہیں کیا تھا۔ نہ اس نے حورعین سے خار کھانے کی کبھی دوبارہ کوشش کی تھی۔ نہ اس نے کبھی دوبارہ حورعین کے لیے برا سوچا تھا کیونکہ ماہر کے ساتھ خوشحال زندگی گزارتے ہوئے فاطمہ اتنا ضرور جان گئی تھی کہ اسے جو کچھ بھی ملا ہے حورعین کی محبت کے ''صدقے'' میں ہی ملا ہے۔